نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۴۲	فہرست مضامین اگست ۱۹۴۲ء	شمار ۲

ملاحظات ---------- ۱

مارکسیت ---------- علی امام ایم۔ اے ---- ۵

ایرانی لٹریچر کا تاریخی پس منظر ---------- سید حکیم احمد نقوی ---- ۹

نئی نارنولی (نظم) ---------- مرزا جعفر علی خاں اثر بی۔ اے ۔ ۱۵

جرمنی اور مغربی یورپ ---------- اصغر عثمانی ---------- ۱۷

نگاہ بازگشت ---------- علی سجاد قہر اکبرآبادی --- ۲۰

مکتوبات نیاز ---------- ۲۷

باب الاستفسار ---------- ۳۱

کاروان نمود (نظم) ---------- ابوالاسرار رمزی اٹاوی --- ۳۵

غزل ---------- پروفیسر شور ---------- ۳۶

وقت کی باتیں ---------- ۳۷

مطبوعات موصولہ ---------- ۴۰

ملاحظات

رفتار جنگ

پچھلے مہینہ جس وقت ہم نے لڑائی پر تبصرہ کیا ہے، حالت یہ تھی کہ سباسٹپول پر جرمنی کی یلغار جاری تھی اور روسیوں کی طرف سے سخت مدافعت ہو رہی تھی۔ مصر میں طبروق کے بعد مطروح کو بھی انگریزوں نے خالی کر دیا تھا اور اسکندریہ خطرہ کے حدود میں آچکا تھا۔ اور ان حالات کو دیکھتے ہوئے سباسٹپول کی طرف سے اتنا اندیشہ نہ تھا، جتنا اسکندریہ کی طرف سے، لیکن نتیجہ اس کے بالکل خلاف ظاہر ہوا۔ یعنی روس کی طرف نہ صرف یہ کہ سباسٹپول بلکہ رسٹوف اور بعض دوسرے اہم مقامات پر بھی جرمن قبضہ ہو گیا اور مصر کی طرف العالمین سے آگے نازیوں نے کوئی اقدام نہیں کیا، یا یہ کہ وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ بہرحال جون کے مہینے جو صورت حال سامنے تھی وہ جولائی میں بہت کچھ بدل گئی اور یہ تبدیلی یقیناً ایسی نہیں ہے کہ آئندہ ہم کسی خوشگوار نتیجہ کی توقع کر سکیں

جیسا کہ ہم پچھلے مہینے ظاہر کر چکے ہیں، روس پر حملہ کرنے سے نازیوں کی وہ تمنا تو پوری نہ ہو سکی جو انھوں نے پچھلے سال قایم کی تھی، لیکن روس بھی باوجود انتہائی مدافعت کے نازی سیلاب کو روک نہ سکا اور اگر فرق ہوا تو صرف اس قدر کہ پہلے سیلاب کا پورا زور ماسکو اور لینن گراڈ کی طرف تھا اور اب اس کا رخ قفقاز کی جانب ہے۔ اس تبدیلی کی وجہ ظاہر ہے، کیونکہ جرمنی پٹرول کی کمی کو اب سختی کے ساتھ محسوس کر رہا ہے اور اس نے سمجھ لیا ہے کہ جب تک وہ ایران، عراق اور باکو کے پٹرولی چشموں پر قابض نہ ہو، لڑائی جاری رکھنا اس کے لئے ناممکن ہے اس طرح گویا لڑائی کا مرکز ثقل اب

یورپ سے ہٹکر مشرق وسطیٰ پہونچ گیا ہے اور نازی کامیابی یا ناکامی کا انحصار اب صرف قفقاز اور مصر کی جنگ پر ہے

اس وقت نقشۂ جنگ یہ ہے کہ جرمن فوجیں کریمیا کے سارے علاقہ پر قابض ہوکر قفقاز کے شمالی حصے میں پھیل گئی ہیں اور روستوف، استراخان اور اسٹالن گراڈ کے مابین جو مثلث نظر آتا ہے اس پر چھا جانا چاہتی ہیں

روستوف دریائے ڈون کے دہانہ پر بحر ازوف کے ساحل کے قریب واقع ہے اور روس کے بڑے شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ پانچ لاکھ سے زیادہ اس کی آبادی ہے اور ایک بڑے تجارتی مرکز ہونے کی حیثیت بھی اسے حاصل ہے۔ اس شہر کا جرمن قبضہ میں چلا جانا یہ معنی رکھتا ہے کہ ایک طرف اس کی فتوحات کریمیا مستحکم ہوگئیں اور دوسری طرف قفقاز کا علاقہ اس کی دسترس سے قریب ہوگیا

لڑائی میں دریاؤں اور پہاڑوں کا عبور کرنا بہت مشکل ہوتا ہے، لیکن روستوف کے فتح ہوجانے سے جرمن فوجوں کو دریائے ڈون کا عبور کرنا آسان ہوگیا، چنانچہ تازہ ترین خبروں سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ نازی فوجیں شمالی قفقاز میں اُس مثلثی حصہ کے اندر جو روستوف، اسٹالن گراڈ اور استراخان کے مابین واقع ہے، پھیلتی جارہی ہیں اور چونکہ یہ علاقہ میدانی ہے اس لئے ان کو روکنا بھی آسان نہیں

اسٹالن گراڈ، روس کا مشہور شہر اور ٹینک سازی کا بڑا مرکز ہے، یہ دریائے والگا کے ساحل پر واقع ہے اور آبادی ۴ لاکھ کے قریب ہے۔ استراخان والگا کے دہانہ اور بحر کاسپین کے ساحل پر واقع ہونے کی وجہ سے اور زیادہ اہم ہے

اس لئے اب لڑائی ایسے علاقہ میں ہورہی ہے جو روس کے شمالی حصہ کو اس کے جنوبی حصہ سے علٰحدہ کرتا ہے اور اگر نازی اس کے حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے تو پھر ماسکو کی طرف سے قفقاز تک کوئی مدد آسانی سے نہیں پہونچ سکتی

ابھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ باکو کے پٹرول تک پہونچنے کے لئے جرمنی کیا راستہ اختیار کرے گا۔ چونکہ باکو بحر کاسپین کے ساحل پر واقع ہے، اس لئے براہ استراخان وہاں تک بحری راستہ سے بھی پہونچ سکتے ہیں، لیکن چونکہ جرمنی کا کوئی جہاز بحر کاسپین میں نہیں ہے، اس لئے بظاہر اسکا امکان نہیں کہ وہ یہ راستہ اختیار کرے گا۔ دوسرا راستہ بحر کاسپین کے کنارے کنارے داغستان ہوتا ہوا گیا ہے، لیکن اس راستہ میں علاوہ دریاؤں کے کوہستانی موانع بھی حایل ہیں۔ ایک تیسرا راستہ طفلس ہوکر ہے، لیکن چونکہ یہ راستہ کوہستان قاف کے دشوار گزار دروں سے ہوکر گیا ہے اس لئے یہاں موانع اور زیادہ سنگین ہیں۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ روس کی حالت بہت نازک ہے اور خطرہ نہایت تیزی کے ساتھ عراق و ایران کی طرف بڑھتا آرہا ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا بھی صحیح نہیں کہ جو کچھ ہونا تھا ہوچکا اور اب اس کا مداوا مشکل ہے

ہرچند روسی مورچہ پر کامیابی کی وجہ سے جرمنی کی توقعات بلند ہوگئی ہیں، لیکن وہ اس حقیقت سے بھی بے خبر نہیں کہ باکو اور ایران کے تیل تک پہونچکر یہ آبجیات حاصل کرنا بہت دشوار ہے، کیونکہ اگر شمالی روس سے کوئی مدد نہ پہونچے، تو بھی ایران و عراق میں اتحادی طیاریاں بہت زبردست ہیں اور ان سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں

اس سلسلہ میں سب سے بڑا مرحلہ جرمنی کے سامنے اسکندریہ اور نہر سویز کا بھی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جب تک اس طرف سے بحر روم کا دروازہ بند نہ کردیا جائے، قفقاز اور عراق و ایران تک اتحادی مدد برابر پہونچتی رہے گی اس لئے یہ بات مشکل سے باور کیجا سکتی ہے کہ وہ مصر کی جنگ کو موجودہ معلق حالت میں چھوڑکر قفقاز پر حملہ کردے گا

اس کی اسکیم یقیناً یہی تھی کہ محوری قینچی کی ایک نوک روس کی طرف سے اور دوسری نوک فلسطین و شام کی طرف سے آکر عراق و قفقاز کے پٹرولی چشموں تک پہونچ جائے، اس لئے اگر مصر کے مورچہ پر جو ٹھیراؤ پیدا ہوگیا ہے، تو اُس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس کی اسکیم بدل گئی ہے، وہ یقیناً اسکندریہ کی طرف حملہ کرے گا اور ہوسکتا ہے کہ اس حملہ کا وقت وہی ہو جو اس نے حملۂ قفقاز کے لئے مقرر کیا ہے

بہرحال اس میں شک نہیں کہ جنگ اب اُس نقطہ پر پہونچ گئی ہے، جو فریقین کے مستقبل کو واضح کرکے بجائے اوہام و شکوک کے تیقنات کے حدود متعین کردینے والا ثابت ہوگا اور موجودہ دور تذبذب ختم ہوجائے گا

دوسرا محاذ اس سلسلہ میں ہم کو اتحادیوں کی تدابیر پر بھی غور کرنا چاہئے۔ جس حد تک انگلستان کے عزم و ارادہ اور امریکہ کی اسلحہ سازی کا

تعلق ہے، ہم کو نتیجہ کی طرف سے مطمئن رہنے کی کوشش کرنا چاہئے، لیکن دشمن کو حقیر سمجھنا بھی خلافِ احتیاط و دانشمندی ہے۔

جرمنی کو روس کے مورچہ پر جو کامیابیاں ہو رہی ہیں، وہ انگلستان و امریکہ میں کوئی قنوطی کیفیت پیدا نہ کریں، لیکن خود روس کی آبادی پر اسکا خراب اثر پڑنا بالکل قدرتی بات ہے اور اسی لئے روس کی سب سے بڑی خواہش اس وقت یہ ہے کہ جرمنی کے خلاف کوئی اور محاذ قایم کرکے قفقار کی طرف سے اس کے دباؤ کو کم کیا جائے

برطانیہ و امریکہ بھی اصولاً اس کو ضروری سمجھتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ یہ محاذ کہاں اور کیونکر قایم کیا جائے۔ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ یوروپ کا ہر وہ علاقہ جس پر نازیوں کا قبضہ ہے اور مشرق کا ہر وہ حصہ جہاں جاپان قابض ہے، محاذ بن سکتا ہے۔ لیکن یہ جواب اس شخص کا ہوگا جو ڈرائنگ روم میں آرام کرسی پر بیٹھکر حکم لگانا جانتا ہے

یہ درست ہے کہ روس و برطانیہ کے مابین جو معاہدہ حال ہی میں ہوا ہے، اُس کی رو سے بھی اخلاقاً دوسرا محاذ قایم کرنا ضروری ہے، لیکن "کب اور کس طرح" کا فیصلہ صرف واقعات و حالات پر منحصر ہے۔ برطانیہ اس وقت جن مشکلات میں مبتلا ہے اور جن اہم ذمہ داریوں کا بوجھ اس کو سنبھالنا پڑ رہا ہے، اس کو دوسرے آسانی سے نہیں سمجھ سکتے۔ روزانہ کروروں پونڈ مصارف کے علاوہ اور بہت سی اقتصادی و سیاسی اُلجھنیں ایسی ہیں جن کو صرف حکومت ہی سمجھ سکتی ہے، چنانچہ ایلڈرشاٹ نے اپنی ایک تقریر میں اس کا اظہار کیا ہے کہ:-

"اس وقت ہمارے سامنے بڑے خطرات موجود ہیں اور اس سے انکار ممکن نہیں کہ آیندہ دو تین مہینے ہمارے لئے بہت زیادہ پُرخطر ہیں"

انھوں نے وادی ڈان کی لڑائی اور بحر اٹلانٹک میں جرمن آبدوزوں کی نقل و حرکت کے متعلق تشویش کا اظہار کیا اور یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ ممکن ہے مشرق میں پھر کوئی تازہ زلزلہ نمودار ہو جائے۔ انھوں نے روس کو مدد پہونچانے کے سلسلہ میں یہ بھی بتایا کہ اس وقت تک جو کچھ ہم نے کیا ہے وہ اپنی فوجی ضرورتوں کے لحاظ سے بہت زیادہ کیا ہے اور اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے

یہ الفاظ برطانیہ کی ایک ذمہ دار ہستی کے ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ دوسرا محاذ قایم کرنے کے لئے ابھی برطانیہ طیار نہیں ہے، لیکن اُس سے یہ نتیجہ بھی نہ نکالنا چاہئے کہ حالات کے موافق ہونے کے بعد بھی دوسرا محاذ قایم نہ کیا جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ سال آیندہ تک حالات مساعد ہو جائیں گو یہ کہنا مشکل ہے کہ اسوقت تک روس نازیوں کے موجودہ دباؤ کو اس حد تک برداشت کر سکے گا یا نہیں کہ دوسرا محاذ اس کی خستگی کا علاج ہو سکے۔

جاپان

جاپان نے فتح برما کے بعد جیسا کہ خیال تھا، ہندوستان کا رُخ نہیں کیا، اس کا ایک سبب موسم کی خرابی بھی ہو سکتا ہے، لیکن سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ چین کی طرف سے مطمئن ہوئے بغیر ہندوستان کی طرف کوئی قدم اُٹھا ہی نہیں سکتا اور اسی لئے اس نے یہ فیصلہ کیا کہ پہلے اس جھگڑے کو ختم کر دینا چاہئے

پانچواں سال ہے کہ چین، جاپان سے لڑ رہا ہے اور ابھی تک لڑائی نتیجہ خیز منزل تک نہیں پہونچی۔ برما کی سڑک جاپانی قبضہ میں چلے جانے کی وجہ سے، چین کو جس آسانی سے برطانوی و امریکی مدد پہونچ سکتی تھی، اب نہیں پہونچ سکتی۔ اسی لئے جاپانی اقدامات اب زیادہ خطرناک صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں، لیکن چینی خارزار ایسا نہیں جس سے جاپانی دامن بغیر تار تار ہوئے علٰحدہ ہو سکے، اور ان حالات میں جاپان کی طرف سے یہ اندیشہ کم ہے کہ وہ ہندوستان یا سائبیریا پر حملہ کر دے گا

گو جاپان محوری حلقہ میں شامل ہے لیکن آجکل حکومتوں کی دوستی بالکل بے بنیاد چیز ہے۔ جرمنی تو بہت عرصہ سے جاپان کو سائبیریا پر حملہ کرنے کی جانب متوجہ کر رہا ہے، لیکن جاپان سمجھتا ہے کہ اس طرح امریکی خطرہ کو خاص ٹوکیو کے اندر دعوت دینا ہے اور باوجود اس کے کہ منچوریا میں اس کی فوجوں کا کافی اجتماع پایا جاتا ہے، اس نے سائبیریا پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کی

ہر چند یہ درست ہے کہ روس کی فوج کا کافی حصہ صرف اس اندیشہ سے کہ مبادا جاپان کسی وقت اس پر حملہ کر دے، سائبیریا کی طرف پھنسا ہوا ہے لیکن اگر یہ خطرہ نہ ہوتا تو بھی سائبیریا میں روسی افواج کا رہنا ضروری تھا، اس لئے اس کا اثر روس کے مغربی محاذ پر نہیں پڑ سکتا۔ البتہ اگر جاپان حملہ کر دے تو مغربی محاذ کی فوجوں کو بیشک مشرق کی طرف منتقل کرنا پڑے گا اور یہ صورت بُری ہوگی

بہرحال موجودہ حالات روس کے لئے ناموافق ہیں اور مستقبل قریب میں بھی کوئی خوشگوار تبدیلی پیدا ہوتی نظر نہیں آتی، لیکن لڑائیوں میں ہوا کا رُخ پلٹتے دیر نہیں لگتی

پچھلے سال ماسکو اور لینن گراڈ کے دروازوں تک پہونچکر نازی فوجیں مایوس و ناکام واپس آئیں اس لئے ہوسکتا ہے کہ امسال قفقاز میں بھی یہی صورت پیش آئے۔ لیکن اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے یہ فرض کرلیں کہ ایران و عراق، فلسطین و شام اور مصر و ہندوستان کی زبردست طیاریاں بھی نازی خطرات کو مشرق سے دور نہ رکھ سکیں گی اور ہٹلر پوری جرمن آبادی کی قربانی پیش کرکے باکو و عراق تک کسی نہ کسی طرح پہونچ ہی جائے گا تو بھی ناتسی حکومت اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتی، کیونکہ اگر بفرض محال عراق و ایران وغیرہ کے پٹرولی چشموں تک اس کی رسائی ہو بھی گئی تو وہاں اسے کیا ملے گا اور اس کی فوری ضرورتیں جو صرف پٹرول ہی کے حصول سے پوری ہوسکتی ہیں، کسی طرح پوری نہ ہوسکیں گی

اگر جاپان ڈچ ایسٹ انڈیز اور برما کے پٹرولی ذخیرہ سے کوئی فایدہ اُٹھا سکا ہے، تو جرمنی کے لئے بھی اس کا امکان ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ جب کسی پٹرولی علاقہ میں آگ لگا دیجاتی ہے تو پھر دوبارہ وہاں سے پٹرول حاصل کرنا برسوں کا کام ہے

اس میں بالکل شبہ کی گنجایش نہیں کہ جرمنی کو پٹرول کی سخت ضرورت ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ اگر امسال اسے پٹرول حاصل کرنے میں کامیابی نہ ہوئی تو اسے ہتھیار ڈال دینے پڑیں گے اور اسی لئے وہ اپنی پوری طاقت قفقاز کی طرف صرف کر رہا ہے، لیکن جیسا کہ ابھی ظاہر کیا گیا وہ قفقاز تک پہونچنے کے بعد بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ برخلاف اس کے برطانیہ اور امریکہ دونوں پٹرولی ذخیرہ کے لحاظ سے اتنی دولت مند ہیں کہ اگر لڑائی دس سال تک جاری رہے تو بھی پٹرول کی کمی کی وجہ سے ان کو شکست نہیں ہوسکتی۔ پھر ایسی صورت میں کہ لڑائی کا انحصار صرف پٹرول پر ہے، ہم آسانی سے نتیجہ کے متعلق حکم لگا سکتے ہیں بشرطیکہ کوئی اور غیر معمولی اسباب حالات میں غیر معمولی تبدیلی نہ پیدا کردیں!

گاندھی جی کی نئی تحریک

جو آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس کے بعد غالباً اگست میں شروع ہوجائے گی، اپنی عملی تفصیل کے لحاظ سے ابھی تک پردۂ خفا میں ہے، لیکن اُصول کے لحاظ سے اس کا علم سب کو ہوچکا ہے۔ اس تحریک کا اصل مقصد برطانوی حکومت سے اپنے آپ کو علٰحدہ کرنا ہے، لیکن بالکل دوستانہ طریقہ سے، دشمنی کے اُصول پر نہیں! یعنی اُن سے یہ کہا جائے گا کہ وہ حکومت کا پورا نظم و نسق ہندوستانیوں کے ہاتھ میں دیدیں اور خود ایک اتحادی کی حیثیت سے محوری حکومتوں کے حملہ سے بچانے میں ہندوستان کی مدد کریں

اس میں شک نہیں کہ مقصد بہت بلند ہے اور آزادی کی تمنا کو بُرا کہنے کی ہمت غلام رکھنے والی قوموں میں بھی نہیں ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا برطانیہ اس مطالبہ کو مان لیگا اور اگر نہ مانا تو اہلِ ملک کیا کریں گے؟

اگر انگریزوں کا تسلط ہندوستان پر محض اخلاقی حیثیت رکھتا تو ممکن تھا وہ ایک مشنری کی طرح اپنے فرایض تبلیغ ادا کرکے ہم کو ہمارے حال پر چھوڑ کر یہاں سے چلے جاتے، لیکن جب ایسا نہیں ہے، تو پھر یہ توقع کیونکر قایم ہوسکتی ہے کہ وہ اپنے تمام اقتصادی و سیاسی اغراض کی قربانی کرکے ہندوستان سے ترک تعلق کرلیں گے اور اگر ایسا ہو بھی تو وہ برطانوی و مستعمراتی فوج سے ہندوستان کی مدد کیوں کرنے لگے؟

بحالات موجودہ جبکہ پچھلے دو سال کی برطانوی زیر باریاں ہندوستان میں برطانوی مستقبل سے بھی بڑا تعلق رکھتی ہیں، کانگرس کا مطالبۂ آزادی اپنی جگہ کتنا ہی قابلِ تعریف کیوں نہ ہو، لیکن عملاً "کج دار و مریز" سے زیادہ نہیں

کسی ایسی مقابمت میں جس کا تعلق ایک طرف محض اخلاق سے ہو اور دوسری طرف مادیت سے، کامیابی کی راہیں کبھی آسانی کے ساتھ نہیں ڈھونڈھی جاسکتیں

بہرحال نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دُنیا دھڑکتے ہوئے دل سے اُس وقت کا انتظار کر رہی ہے جب گاندھی جی کی نئی تحریک شروع ہوگی اور ہوسکتا ہے کہ اس کا ردِ عمل بجائے سکون کے اور زیادہ اضطراب پیدا کرنے والا ثابت ہو، لیکن جب ایک شخص اپنے آپ کو طوفان میں ڈال دینے کا فیصلہ کرتا ہے تو پھر اس کو سکون و اضطراب کا فلسفہ سمجھانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

مارکسیت

سیاسی بحثوں میں اکثر ہمارے کان لفظ مارکسیت سے آشنا ہوتے رہتے ہیں۔ خصوصاً نوجوان طبقہ اس نظریۂ زندگی کو ہر سیاسی، سماجی، ذہنی اور ارتقائی کش مکش کا واحد حل سمجھتا ہے۔ لیکن اس لفظ کے جتنے نام لیوا ہیں شاید اتنے ہی اس کے معنی بھی تراش لئے گئے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ مارکسیت ایک اقتصادی نظام ہے تو دوسرا اس کو ہر زاویہ نگاہ میں انقلاب سے تعبیر کرتا ہے۔ عامیانہ تشریح یہ ہے کہ اس نظریہ کا بانی یعنی کارل مارکس اشتراکیت کا باوا آدم تھا اور اس کی پیشین گوئیوں پر عمل پیرا ہو کر لینن نے روس میں انقلاب برپا کیا۔ لیکن شاید ان تمام حضرات کے تعجب کی انتہا نہ رہے جب ان کو یہ معلوم ہو کہ یہ تمام تشریحات محض فروعی ہیں اور خود نظریۂ مارکسیت کو زمان و مکان میں نہیں گھیرا جا سکتا۔ اس کا قیام مارکس سے بہت پہلے موجود تھا۔

مارکسیت ایک فلسفہ ہے لیکن وہ دیگر فلسفوں سے مختلف ہے۔ دیگر فلسفے ایک حد پر جا کر ختم ہو جاتے ہیں لیکن مارکسیت آگے قدم بڑھاتا ہے۔ دوسرے فلسفہ مزعومات اور اعتقاد کے گورکھ دھندے ہیں جبکہ مارکسیت تاریخ کی مادی تشریح کا نام ہے۔ بعض حضرات اس کو تاریخ کی اقتصادی تشریح سمجھتے ہیں لیکن ایسا کرنے سے مارکسیت محض روٹی اور کپڑے کے مسایل میں محدود ہو جائے گا۔ مارکسیت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اقتصادی نظریات، سیاسی اصول اور عمل کا پروگرام تو محض اس کی شاخیں ہیں چونکہ مارکسیت زندگی کا فلسفہ ہے اس لئے وہ زندگی کے تمام مسایل کا راز دار ہے۔

مارکسیت ایک مادی فلسفہ ہے لیکن مارکسی مادیت عمومی مادیت سے بہت مختلف ہے۔ نہ تو مارکسیت کارل مارکس کی ایجاد کردہ ہے اور نہ کسی ایک فرد نے اسکو بنایا۔ کارل مارکس کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے پندرھویں صدی سے انیسویں صدی عیسوی تک کے تمام سائنسی خیالات انسانی تجربات، افکار اور خیالات کو اکٹھا کیا۔

یورپ میں پندرھویں اور سولھویں صدی میں زبردست ذہنی ہیجان تھا اور خیالات میں سخت انتشار۔ پرانا نظام چولا بدل رہا تھا بلکہ قدیم سماج کے بطن سے ایک نیا بچہ پیدا ہو رہا تھا۔ انسانی طبیعتوں میں تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ پرانی تہذیب اپنی افادیت کھو چکی تھی۔ تصوف اور مابعد الطبیعیات انسانی ذہن کو پسپا رکھنے کی ناکام کوششیں کرتے کرتے تھک چکے تھے۔ چنانچہ ایسے نظام کی ضرورت تھی جو سماجی جمود اور ذہنی سکرات کو ختم کر دے۔ جب ہم اٹھارویں صدی عیسوی کے سیاسی انقلابات کا مطالعہ کریں تو ہمیں پندرھویں اور سولھویں صدی کا پس منظر بھولنا چاہئے۔

جب ہم کہتے ہیں کہ مارکسیت ایک فلسفہ ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا فلسفہ بذات خود کیا شے ہے؟ اس کے جواب میں اس قدر اختلاف رائے ہے کہ شاید ہی دو فلسفی متفق ہوں۔ لیکن اگر ہم فلسفہ کی تاریخ پر غور کریں تو ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ کائنات کی مادی تشریح کا نام فلسفہ ہے۔ اگر ہم قدیم ترین فلسفہ کا مطالعہ کریں تو کیا مشرق اور کیا مغرب ہم یہی پائیں گے کہ اس کی بنیاد عقلیت پر تھی وہ انسان کے ماحول اور اس کے تعلقات کا تجزیہ کرنا چاہتا تھا لیکن علوم کی کمی اور عقول کی تنگی کے باعث قدم قدم پر اس کی یہ کوشش رائیگاں گئی۔ آج کل یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مذہب انسان میں فطرتاً موجود ہے اور اعتقاد ایک لابدی امر ہے لیکن انسان کی قدیم تاریخ اس کی شاہد ہے کہ انسان کی فطرت میں اعتقاد نہ تھا۔ اس کو اسباب علل معلوم کرنے کا شوق تھا اور وہ فطرتاً غیر متقلد تھا۔ اعتقاد کا قیام انسانی ذہن میں اسوقت ہوا جب وہ تنگ نظری اور کم علمی کی وجہ سے کائنات کا تجزیہ نہ کر سکا لیکن ناکامی کا اعتراف اس کی غیرت کے خلاف تھا چنانچہ اس نے اپنی اس نام نہاد ناکامی کو مفروضات کے سلسلہ سے وابستہ کر دیا۔

سائنسی طریقۂ فکر کے سبب مارکسیت ظہور میں آیا "خیال" کے یہ معنی نہیں کہ کسی شے کو فرض کر لیا جائے۔ اگر کسی شے کی جستجو کے لئے مفروضات کی ضرورت ہے تو وہ جستجو زیادہ قابل قدر نہیں ہو سکتی اور نہ اس کے نتائج محکم ہوں گے۔ سائنسداں مفروضات اسی وقت لائے گا جب وہ اس کو تجرباتی جستجو کی کسوٹی پر پرکھ

زمانہ جدید کے سائنسی خیالات نے کلاسیکی فلسفہ کو ختم کر دیا جو ہزار بارہ سو سال سے یورپ پر چھایا ہوا تھا۔ اس کے باوجود بھی سائنسی خیالات اور عقلیت پر اسی وقت پورا پورا بھروسہ کیا جائے گا۔ جب ان کو تجربہ کی بنا پر آزما لیا جائے۔ بعض سائنسی مفکر بھی مفروضات اور مابعد الطبیعیات کے چکر میں مبتلا ہو جاتے ہیں کیونکہ کائنات کے تجزیہ میں علوم اور سائنسی آلات کی کمی کی وجہ سے انھیں اب تک ناکامی ہو رہی ہے۔ مارکس سے قبل جدید فلسفہ اسی اُلجھاوے میں پڑا تھا۔ مفکرین پُرانے مفروضات ترک کر کے نئے نئے مفروضات کے چکروں میں پھنس جاتے تھے۔ مثال کے طور کانٹ کو لے لیجئے۔ اس کے فلسفہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ حد درجہ کا "مسترد کن" تھا لیکن لطف یہ کہ پُرانے مابعد الطبیعیاتی عقاید مسترد کر کے اس نے نئے ایجاد کر دئے۔

مارکس نے قدیم فلسفہ کو ختم کر دیا۔ اس نے کہا کہ "خیالات" حقیقت ہیں۔ قدیم فلسفی خیالات کی حقیقت سے انکار کرتے تھے۔ مارکس پہلا مادی تھا جس نے خیالات میں داخلی حقیقت کو دریافت کیا۔ اس نے کہا جب ایک بار بھی خیالات پیدا ہو جائیں اور انسانی ذہن میں ان کا تسلسل قایم ہو جائے تو وہ اتنے ہی اصلی ہوں گے جیسے کوئی طبعی شے۔ چنانچہ اس کے نزدیک "خیالات" طبعی اور مادی ہوتے ہیں ایک اور سوال تھا جس کا جواب مارکس نے دیا "مادہ یا خیال" پہلے کس کا وجود تھا؟ اس کا تعلق انسانی خیالات اور ارتقا سے ہے ہیگل کے مطابق نوع انسان کی تاریخ فلسفہ کی تاریخ ہے۔ چنانچہ اس کے نزدیک خیال ہمیشہ سے قایم تھا اور مادہ ان ہی خیالات کا ایک سلسلہ تھا۔ یا بالفاظ دیگر ایک وسیلہ۔ لیکن مارکس نے اس سے اختلاف کیا۔ اس نے یہ سوال اُٹھایا کہ "خیالات وجود ہی میں کیونکر آئے"؟ اس نے کہا کہ اگر بقول ہیگل نوع انسانی کی تاریخ فلسفہ کی تاریخ ہے تو اس کا راز خیال میں مضمر ہوگا جو فلسفہ کا ایک ذریعہ ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ جوں ہی "خیال پیدا ہو جائے گا انسانی کردار اور ارتقا بھی اسی خیال کے زیر اثر رہیں گے جس کے معنے یہ ہوئے کہ انسان ایک خیالی جال میں پھنسا رہے گا اور اس کی تمام حرکات اور عادات، کردار اور ارتقا، سب قایم شدہ خیال کے ماتحت ہوں گے۔ پھر انسان کبھی بھی خیال کی جبریت سے باہر نہیں آسکتا۔ لیکن تاریخ میں ایسا نہیں ہوا۔ ان خیالات کی جبریت سے انسان ہمیشہ جدوجہد کرتا رہا ہے۔ دُنیا کا ارتقا ہی اس جبریت سے گریز کے باعث ہوا۔ ہیگل نے تشفی بخش جواب نہیں دیا اور نہ اس نے یہ بتلایا کہ یہ خیال پیدا کیونکر ہوا۔

سائنسی علوم مثلاً بشریات اور علم آثار قدیمہ کے ذریعہ مارکس نے سماج کی ابتدا کی جستجو شروع کی اور وہ اس نتیجہ پر پہونچا کہ انسان کے خیالات زمانے کے طریق پیداوار کے مطابق قایم ہوتے ہیں۔ معاش کی جستجو میں انسان جو طریقہ اختیار کرتا ہے وہ اس کے خیالات کی بھی عکس کشی کرتے ہیں۔ یعنی یہ کہ مادہ پہلے اور خیال بعد میں۔ اس نتیجہ نے مسایل زندگی کی بہت سی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھا دیا۔ یہ صحیح ہے کہ بہت سے موجودہ فلسفی اور سائنسداں مارکس کی اس تشریح کے قایل نہیں ہیں لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ انسان کے خیالات اسکے ماحول کا آئینہ ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بیسویں صدی میں بھی بعض قومیں قدیم تہذیب کو سینے سے لگائے ہیں جبکہ ان کی ہمسایہ قومیں تہذیب نو کا گہوارہ ہیں اگر ایک قوم میں جاگیری نظام موجود ہے تو دوسری میں سرمایہ داری اور تیسری میں اشتراکی۔ مارکس کی اس تحقیق کے بعد فلسفہ کے بہت سے مسائل حل ہو گئے اور انسان پہلی بار ایک خیالی غلام کے بجائے تاریخ کے اصلی رنگ روپ میں نظر آیا وہ اپنی ماہیت سے واقف ہوا۔ اس نتیجہ پر پہونچنے کے بعد مارکس نے فلسفہ کی بالکل نئی تعریف کی۔ اس کا قول ہے کہ فلسفہ دنیا کی تشریح ہی نہیں کرتا ہے بلکہ اس کو بدل بھی سکتا ہے۔ مارکس سے قبل ہر فلسفی نے دنیا کو جوں کا توں مان لیا اور یہ سوال نہیں اُٹھایا کہ یہ چیزیں کیسے پیدا ہوئیں اور اپنی موجودہ شکل میں کیونکر آئیں۔ جس شکل میں کائنات کے سامنے موجود تھی اور جو جو حرکتیں اشیا میں ہوتی رہتی تھیں انھوں نے ان کو تسلیم کر لیا اور ان حرکتوں اور عمل کی تبدیلیوں ہی پر تجربے کرتے رہے کسی نے بھی اس عمل کی وجہ دریافت نہ کی۔ وہ یہی سمجھتے رہے کہ اشیاء کے عقب میں کوئی پوشیدہ قوت موجود ہے جو اپنے اشاروں سے دنیا میں تبدیلیاں کرتی رہتی ہے ہر مشاہدہ کی جڑ کسی خیالی بنیاد پر قایم تھی۔ مارکس نے ان تصورات کو مسترد کر دیا۔ بقول اس کے انسان کائنات کی تشریح کر سکتا ہے کیونکہ کائنات کے بنانے میں اس کا ہاتھ ہے۔

فلسفہ کا کام دنیا کی تشریح کرنا ہی نہیں بلکہ اس کو تبدیل بھی کر دینا ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ انسان دُنیا بنا سکتا ہے تو ہم کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ہمارے پیشرو اور قدما نے اس دنیا کو بنایا تھا جس میں ہم رہتے ہیں۔ یہ نظریہ مذہبی خیالات و افکار کی جڑ کاٹ دیتا ہے اور اعتقاد کو کالعدم کر دیتا ہے۔ مارکس سے قبل تصوراتی فلسفہ نے مذہبی خیالات رد کر کے تقدیریت قایم کر رکھی تھی۔ جس کے بموجب انسان اپنے ماحول کا شکار تھا نہ اس کو اپنے ماحول پر قدرت تھی اور نہ وہ اس کو بدل ہی سکتا تھا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ انسان ایک بہت بڑے خیالی جیل خانے میں بند ہے جس میں ہر کام کسی غیر فطری قوت کے اشاروں

پر ہوتا ہے - اور بے چارہ انسان کٹھ پتلی کی طرح ناچتا رہتا ہے - مارکس نے اس کہنہ خیالی کو ختم کرنے کی کوشش کی - سائنسی علوم سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ انسان کے خیالات، اعتقادات، کردار اور ارتقا سب زندگی کے ماحول سے تشکیل پاتے ہیں لیکن ان کے ساتھ ساتھ انسان اس ماحول پر ردِ عمل کرتا ہے اور ان کو اپنے موافق بناتا ہے - اس کے حرکات اس کے ماحول سے اس قدر وابستہ ہیں جس قدر اس کا وجود - چنانچہ وہ اپنے ماحول ہی کا بنانے والا نہیں ہے بلکہ تاریخ کا بنانے والا بھی ہے -

تاریخ کی مادی تشریح کے ذریعہ مارکس نے انسانی ارتقا کی تاریخ از سرِ نو لکھی اس سے پہلے تاریخ چند غیر معتبر واقعات کا مجموعہ تھی - لوگوں کو تاریخی واقعات پر اتنا ہی ایمان تھا جیسے خدا پر یا مذہب پر کبھی ان واقعات کی چھان بین نہیں کی گئی - اکثر سینہ بہ سینہ صحیح یا غلط واقعات چلے آتے تھے - لیکن کوئی ان پر اعتراض نہیں کرتا تھا - چونکہ کوئی مورخ ایک واقعہ کو لکھ گیا ہے اس لئے اس پر ایمان رکھنا ان کا فرض ہو جاتا تھا تمام مذہبی رزمیہ نظمیں اس کے ثبوت میں موجود ہیں - مارکس نے تاریخ کو سائنس کا رتبہ دیا - جس طرح سے کہ طبعی دنیا کا کوئی امر بغیر سبب کے رونما نہیں ہو سکتا اسی طرح تاریخی واقعات بھی گزشتہ واقعات کے مرہون منت ہیں - تاریخ کے اس بنیادی اُصول پر تہذیب و تمدن کا نشو و نما ہوا اور انسانی ارتقائی منازل پر پہونچا - لیکن عمل اور ردِ عمل کے بغیر انسان ہر گز ارتقائی منازل پر نہیں پہونچ سکتا - اس نے جب ایک نظام قایم کیا تو اس میں یہ بھی اہلیت تھی کہ وہ اس نظام کو تبدیل بھی کر سکے - مثلاً اس نے جب جاگیری نظام کی بنیاد ڈالی تو اسی کو اُکھاڑ بھی پھینکا - یہ ہے جدلیات کا اُصول جس کو مارکس نے دنیا کے سامنے پیش کیا وہ کہتا ہے کہ ہر شے میں اس کے عمل اور ردِ عمل کی قوتیں موجود رہتی ہیں -

مارکس نے اپنے عہد کے سرمایہ داری نظام کو جدلیاتی کسوٹی پر پرکھا - اس نے ثابت کیا کہ اس کے عہد سے قبل انسانی ذہنیت، خیالات، علوم و فنون اور انسانی قدریں سب ہی جاگیری سماج کے محور پر گھومتی تھیں لیکن جس وقت جاگیری سماج کے نقائص عیاں ہو گئے - پوشیدہ جراثیم اُبھر آئے اور کمزور نظام اپنی افادیت کو کھو چکا تو سرمایہ داری نے اس کو ایک ہی دھکے میں گرا دیا اور روز افزوں انسانی ضروریات کے مطابق ایک نیا نظام قایم کیا - لیکن سرمایہ داری نظام میں بھی اس کے ردِ عمل کی قوت پوشیدہ تھی - جب تک یہ نظام بنی نوع انسان کی ترقی کی شاہراہ بنا رہا زیادہ سے زیادہ لوگ اس پر گامزن رہے لیکن جب اس شاہراہ کی ملکیت سمٹ کر صرف پانچ فیصدی لوگوں کے ہاتھوں میں آگئی تو یہ نظام بھی تاریخ کی چکی میں پیس ڈالا گیا اور اشتراکیت کا قیام ہوا مارکسیت کے بموجب اشتراکیت بھی انسانی ترقی کی آخری منزل نہیں ہے - یہاں ایک غلط فہمی کے ازالہ کی سخت ضرورت ہے - بہت سے اشتراکی اور مارکس کی کتابوں کو طوطے کی طرح رٹنے والے حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ مارکسیت کے معنے ہیں ایک اشتراکی نظام جس میں اشیا کی ذاتی ملکیت ختم کر کے اجتماعی ملکیت قایم کر دی جائے لیکن ایسے حضرات کنویں کے مینڈک کی طرح مارکسیت کو روٹی اور کپڑے ہی کے سوال پر ختم کر دینا چاہتے ہیں - مارکسیت کا دائرہ بہت وسیع ہے وہ توہم پرستی اور ہیرو پرستی، اعتقاد، تنگ نظری قومیت، استبدادیت اور ریاست کا قاطع ہے - وہ محض ایک اقتصادی یا سیاسی اُصول ہی نہیں ہے - اسکی ہمہ گیری میں زندگی کا ہر پہلو اور معاشرت کا ہر شعبہ کائنات کی تمام اشیا ر تاریخ، سائنس اور علوم و فنون سب ہی داخل ہیں لیکن مارکسیت چند سخت اُصولوں کا مجموعہ نہیں ہے نئے نئے انکشافات کے بعد، سائنسی تجربات ہونے پر، تجرباتی آلات کی ترقی سے اور علوم و فنون کی افزایش کے بعد مارکسیت میں ترمیم ہو سکتی ہے مارکس نے نہ تو پیغمبری کا دعوے کیا اور نہ اس نے اپنی پیشین گوئیوں کو اٹل ہی سمجھا - تاریخ کے مطالعہ، سماج کے حالات اور سائنسی خیالات کی روشنی میں مظاہر قدرت کی تحقیق و تدقیق کرنے کے بعد مارکس اس نتیجہ پر پہونچا تھا کہ تاریخ میں ہم آہنگی ہے اور دنیا میں تبدیلیاں ایک خاص اُصول پر ہوتی ہیں - چنانچہ اس نے جو پیشین گوئی کی وہ یہ تھی کہ آیندہ زمانے میں سرمایہ داری کے شکست کھانے اور اشتراکیت کے قایم ہونے کا بہت امکان ہے - اس نے یہ کبھی نہیں کہا کہ یہ تبدیلی حتماً اسی طرح واقع ہو گی جیسی وہ سمجھتا ہے - خاص فاشیزم کے متعلق مارکس کچھ نہ کہہ سکا کیونکہ اُنیسویں صدی کی سرمایہ داری میں اسکا امکان نہ تھا - بیسویں صدی میں سرمایہ دار نے تاریخ اور سائنس سے بہت کچھ سیکھا اور اپنی ساکھ کچھ دن اور قایم رکھنے کی غرض سے فاشیزم کو عروج دیا - ایک دوسری مثال لیجئے - مارکس کے زمانہ میں علم طبیعیات ہنوز ابتدائی منازل میں تھا - اس وقت یہ خیال کیا جاتا تھا کہ کائنات میں مادہ بہت سے طبعی یا مادی تودوں کی شکل میں موجود ہے - مارکس کا بھی یہی خیال تھا - لیکن زمانہ حال کی تحقیقات نے اس نظریہ کو مسترد کر دیا ہے - جدید سائنس کے مطابق کائنات میں مادہ برقیوں اور پروٹونوں[1] کی شکل میں موجود ہے چنانچہ اگر ہم مارکس کے کہنے پر سختی سے پابند رہیں، تو ہم غیر سائنسی اور جو ایسے کے متضاد ہے

---

[1] یعنی (Electron) اور (Proton) پروٹون کا ترجمہ سالمہ ہونا چاہیئے (نیاز)

فرض کیا جائے ایک مارکسی خیالات کا انسان ایسے سماج میں منتقل کر دیا جائے جس میں ہنوز قدیم نظام قایم ہے۔۔۔

ایرانی لٹریچر کا تاریخی پس منظر

(بہ سلسلۂ ماسبق)

تیسرا دور

تیسرا دور ۷۰۰ ق م سے شروع ہوتا ہے اور ۵۵۰ ق م پر ختم ہوتا ہے۔ یہ دور سلطنتِ میڈ سے متعلق ہے جس کے دو پایۂ تخت ہمدان اور رے مانے گئے ہیں۔ اس سلطنت کے بادشاہوں کے نام اوپر آچکے ہیں۔ یہ ایک وسیع سلطنت تھی جس کا اقتدار [illegible] ایران کے علاوہ ملک شام تک قائم ہوگیا تھا۔ اہل میڈیا کے اُس زمانہ کی زبان اور مذہب کے کوئی حالات یقینی طور پر معلوم نہیں۔ یہ لوگ عناصر پرست معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں کوئی مندر یا مورتی نہیں تھی پہاڑوں کی چوٹیوں پر پرستش کرتے تھے۔ پوجا کرنے والا فرقہ مجوس کہلاتا تھا۔ اُن میں جو لوگ آگ کی پوجا کراتے تھے وہ آتھرَوان کہلاتے تھے۔ [illegible] زبان کی کوئی یادگار کتبہ یا سکہ کی شکل میں دستیاب نہیں ہوئی ہے۔ بعض نے قیاس یہ کیا ہے کہ آوستا کی زبان ہی میڈیا کی زبان تھی۔ لیکن یہ خیال بالعموم تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اہل تحقیق کی رائے ہے کہ میڈیا کی زبان قدیم فارسی کے مانند کوئی زبان ہوگی۔ قدیم فارسی کا ذکر آگے آئے گا۔

یہی وہ دور ہے جس میں زردشت کی بعثت قرار دیگئی ہے۔ زردشت کی وفات ۵۸۳ ق م میں بعمر ۷۷ سال مانی گئی ہے اور اُس کا قوم میڈ کے فرقۂ مجوس سے ہونا اور آذربائیجان (میڈیا) کا باشندہ ہونا قرار دیا گیا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ زردشت کو اپنے وطن علاقۂ میڈیا میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی جس کی وجہ سے بلخ کی جانب ہجرت کی نوبت آئی۔ بلخ میں پہونچکر وہاں کے مقامی بادشاہ وشتاسپ یا گشتاسپ نے زردشت کے پیش کردہ مذہب کو قبول کیا اور یہیں سے مذہب زردشتی ایران کے سارے علاقہ میں پھیل گیا۔ زردشت سے ایک صحیفۂ ضخیم منسوب ہے جس کو آوستا یا آوستا کہتے ہیں۔ پرانی روایتیں ظاہر کرتی ہیں کہ یہ صحیفۂ بزرگ بیلوں کے چمڑوں پر سنہرے حرفوں سے تحریر کیا جاکر اخمنی سلطنت کے اخیر زمانہ میں مرتب کیا گیا تھا اور سکندر کے حملہ کے وقت اصطخر کی تباہی میں ضایع ہوگیا۔ اب اُس کے صرف چند اجزا باقی ہیں جن میں سب سے قدیم وہ حصہ ہے جس کو گاتھا کہتے ہیں۔ اس حصہ کی نسبت محققین کی رائے ہے کہ گو یقین کے ساتھ نہیں مانا جاسکتا کہ وہ خود زردشت کی تصنیف ہے تاہم اس امر کے باور کرنے کی کافی وجوہ ہیں کہ حصۂ مذکور میں زردشت کی اصلی تعلیم کا صحیح خلاصہ درج ہے اور یہ کہ اُس کی زبان علاقۂ میڈیا کی یا اُس سے ملتی جلتی کوئی زبان ہے۔ موجودہ زمانہ میں ایران کی بعض دیہاتی زبانیں نیز پشتو آوستی زبان سے ہی ماخوذ خیال کی جاتی ہیں۔

چوتھا دور

چوتھا دور اخمنی سلطنت کے آغاز یعنی ۵۵۰ ق م سے شروع ہوتا ہے۔ کوروش علاقۂ ایلام و پارس کا شہزادہ تھا جس نے خروج کرکے میڈیا کی سلطنت کو نیست و نابود کیا اور ایک نئی زبردست سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اہل میڈیا ایران کی شمال مغربی قوم تھے اور اب ایران کی جنوبی قوم پارسی نے اقتدار حاصل کیا اور سلطنت کو ہند۔ یونان و مصر تک وسعت دی۔ اس حکومت کا ابتدائی پایۂ تخت شہر سوس علاقۂ ایلام میں تھا جس کے اب محض کھنڈر باقی ہیں خروج کرنے کے بعد اس قوم کا دارالسلطنت شہر پارس ہوا جس کو یونانی پرسی پولس کہتے تھے اور ایرانی اصطخر کسی مابعد زمانہ میں بلخ بھی دارالسلطنت رہا۔ اس قوم کے کئی بادشاہ ہوئے جو شاہان اخمنی کہلاتے ہیں۔ اس خاندان کا آخری تاجدار شہنشاہ دارا تھا جس نے سکندر سے شکست کھاکر اپنے ساتھ ایرانی سلطنت کو بھی صدیوں کے لئے مدفون کر دیا۔ اس سلطنت کے اخیر زمانہ میں مذہب زردشتی علاقۂ پارس میں بھی رواج پاچکا تھا لیکن سوائے چند کتبوں کے جو اخمنی بادشاہوں نے پہاڑوں پر کندہ کئے کوئی ایسی تحریری یادگار اُس زمانہ کی باقی نہیں جس سے اُس وقت کے کچھ حالات معلوم ہوسکیں۔ تھوڑی بہت ہوئی کہ یہ کتبے پڑھے گئے ہیں ورنہ اس سے پہلے یہ محض نقش و نگار سمجھے جاتے تھے۔

از نقش و نگارِ در و دیوار شکستہ — آثار پدید ست صنادیدِ عجم را

اِن کتبوں کی جو زبان ہے اُس کو قدیم فارسی کہا جاتا ہے اور یہی زبان سنسکرت کی بہن مانی گئی ہے۔ آوستا کی زبان کو ہندوستان کے ویدوں کی زبان کے ہمرنگ تصور کرنا چاہیئے۔

پانچواں دور اخمنی سلطنت کا دور ۳۳۰ ق۔م میں ختم ہوا۔ سکندر کے بعد کچھ عرصہ تک یعنی صرف دو چار پشت تک ایران کی عنانِ حکومت یونانیوں کے ہاتھوں میں رہی۔ لیکن اِس کے بعد خراسان کی ایک قوم نے جس کو پارتھی کہتے ہیں یونانیوں سے سرتابی کر کے یونانی حکومت کو برطرف کر دیا اور پارتھی حکومت نے ایران میں شہر رے کو دارالحکومت بنا کر قایم کی۔ اس حکومت کا قیام پانچسو برس سے زیادہ رہا لیکن شاہنامہ اور دیگر مشرقی کتابوں میں اس زمانہ کو بہت مختصر کر کے ظاہر کیا گیا ہے اور صرف چند بادشاہوں کے نام گنائے گئے ہیں اور بالعموم اُس کو طوائف الملوکی اور اشکانی حکومت کے زمانہ کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور ساسانی حکومت کا آغاز کر کے اُس کا کیانی کیانی سلطنت سے جوڑ ملا دیا ہے۔ اس زمانہ کو مختصر بنانے کی وجہ مورخین نے یہ ظاہر کی ہے کہ جب اردشیر بابکان نے ساسانی حکومت قایم کی۔ اُس وقت لوگوں میں یہ روایت مشہور تھی کہ ایرانی حکومت سکندر کے بعد ایکہزار برس تک قایم رہے گی۔ چونکہ اردشیر کے وقت تک پانچ سو سے زیادہ سال گزر چکے تھے اس لئے اپنے خاندان کی حکومت کا رعب و داب قایم و برقرار رکھنے کے لئے اردشیر نے قومی تاریخ کے صفحات سے کئی سو برس اُس زمانہ سے کم کر دئے جو سکندر کے وقت سے اُس کے عہد تک گزرے تھے۔ دوسری وجہ اُس زمانہ کو پردۂ خفا میں رکھنے کی یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ اہلِ پارس یعنی ایران کے جنوبی علاقہ کے ایرانیوں کے نزدیک پارتھیوں کی حکومت کوئی قومی حکومت نہ تھی۔ انھوں نے اس سارے زمانہ کو ملکی زوال و بدنظمی کا زمانہ قرار دیکر اُس کو بھول میں ڈالدینا ہی مناسب خیال کیا تھا باوجود اِن تمام باتوں کے محققین کے نزدیک یہ زمانہ کئی اعتبار سے اہم خیال کیا جاتا ہے۔ اول تو یہ پارتھیا کے ہی بادشاہ تھے جنھوں نے ایران کو سلطنتِ روما کی دست درازی سے محفوظ رکھا۔ دوسرے آوستا کے اوراق پریشان کو جمع کرنے کی کوشش کی۔ تیسرے اس زمانہ میں ایک نئی زبان قدیم فارسی سے نکلی جس کو عام طور پر پہلوی زبان کہتے ہیں۔ اور قدیم فارسی بول چال کے دائرے سے خارج ہو گئی۔ اس پارتھی یا اشکانی حکومت کا آخری بادشاہ اردوان تھا جس نے اردشیر بابکان سے ۲۲۶ء میں شکست کھائی۔

چھٹا دور اردشیر بابکان کے وقت سے چھٹا دور ساسانی حکومت کا شروع ہوتا ہے اور اِسی وقت سے شاہنامہ کا بیان افسانہ کے پہلو کو چھوڑ کر یونانی مورخوں کے بیان سے ملتا جلتا پایا جاتا ہے۔ یہ دور پہلوی زبان کی ترقی کا دور ہے اس زمانہ کی یادگار ساسانی بادشاہوں کے چند کتبے ہیں۔ علاوہ ازیں آوستا کے جو اجزا مل سکے اُن کی فراہمی کی تکمیل بھی انھیں بادشاہوں کی نگرانی میں ہوئی اور اُن کا ترجمہ بھی پہلوی زبان میں کیا گیا۔ عرب کے تسلط کے زمانہ سے عربی زبان اور عربی قواعد صرف و نحو نے تصرفِ کامل کر کے پہلوی زبان کی وہ شکل بنادی جو موجودہ فارسی ہے۔ پہلوی زبان کی اس وقت جو کتابیں موجود ہیں وہ تقریباً سب عربی تسلط کے زمانہ کی تصنیف ہیں۔

ساسانی دور کی ایک اہمیت یہ ہے کہ اُس میں دو مذہبی انقلابات رونما ہوئے۔ اولاً ایک شخص مانی نے ایک نئے مذہب کی اختراع کی کوشش کی۔ اُس نے عیسوی مذہب کے بعض اُصولوں کو مذہبِ زردشتی سے پیوست کرنا چاہا اور خیر و شر، نور و ظلمت کی نئی بنیادیں قایم کر کے دینِ مروجہ میں ترمیم کی۔ پروفیسر براؤن کے قول کے مطابق مذہبِ زردشتی دینوی اور قومی پہلو لئے تھا۔ اس کے برعکس مانی نے ترکِ دُنیا کو اپنے دین کا اُصول قرار دیا۔ مانی کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اُس نے کئی کتابیں مختلف زبانوں میں تصنیف کیں۔ اُن میں سے ایک ارتنگ ہے جس کو اُس نے اپنے ایجاد کردہ حروف میں خطِ گلزار کی طرز پر بہت خوشنما طریقے پر تحریر کیا تھا۔ مذہبِ زردشتی نے مانی کے دین کو کُفر قرار دیا اور خلفائے عباسیہ کے زمانہ تک یہ فرقہ ہمیشہ معتوب رہا۔ عہدِ اسلام میں اس فرقہ کے عقیدہ رکھنے والوں کو بالعموم زندیق کہتے تھے۔

دوسرے انقلاب کا بانی مزدک تھا جس نے قباد اور قباد کے لڑکے نوشیرواں کے زمانہ میں مذہبِ زردشتی میں ایک اور شاخ پیدا کی۔ اس شخص کے عقائد و اُصول وہی معلوم ہوتے ہیں جو موجودہ زمانہ میں سوشلسٹ یا کمیونسٹ (اشتراکی) لوگوں کے ہیں۔ اُس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اُس نے عورتوں کو بھی مال مشترک قرار دیا تھا۔

مندرجۂ بالا ملکی دوروں کو واضح طور پر ذہن نشین کرنے کی غرض سے ایک نقشہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:-

نمبر شمار	شاہنامہ کے مطابق				یونانی مورخوں کے مطابق				تشریح
	نام خاندان	بادشاہوں کے نام	مدت حکومت	سنہ	نام خاندان یا قوم	بادشاہوں کے نام	مدت حکومت	سنہ	
۱	پیشدادی	۱-کیومرث ۲-ہوشنگ ۳-طہمورث ۴-جمشید	۳۰ سال ۴۰ سال ۳۰ سال ۷۰۰ سال						۱- محققین کے نزدیک کل پیشدادی بادشاہ کوئی تاریخی وجود نہیں رکھتے ان میں سے بعض کے ناموں کے متعلق مثلاً کیومرث جمشید۔ ضحاک۔ فریدوں کی نسبت یہ معلوم ہوا ہے کہ یہ نام ان افسانوں سے تعلق رکھتے ہیں جو ہندوستان اور ایران کی متفقہ قوم آریہ کا مشترک سرمایہ ہیں۔ اور بنا خاص سرزمین ایران سے کوئی تعلق نہیں۔
۲	سامی	ضحاک	ایکہزار سال	نامعلوم					
۳	پیشدادی	۵-فریدوں ۶-منوچہر ۷-نوذر	ایکہزار سال ۱۲۰ سال ۷ سال	ہمعصر موسیٰ تقریباً	قوم میڈ یعنی علاقہ ہمدان و آذربائیجان کے بادشاہ	۱-آرباسیس ۲-مناداسیس ۳-سوزرمس	۱۸ سال × ×	تقریباً ۷۶۰ ق م قبل مسیح کا زمانہ	۲- بعض کا خیال ہے کہ ضحاک کی حکومت کا وہ دور ہے جس میں شمال و مشرقی حصہ ایران عسوری سلطنت کی ماتحتی میں رہا۔
۴	ترکی	افراسیاب	۱۲ سال	نامعلوم	×	×	×	×	۳- اسی طرح بعض کا یہ خیال ہے کہ افراسیاب کی مداخلت تاتاری قوم کے حملوں کی مترادف ہے۔
۵	پیشدادی	۸-زو ۹-گرشاسپ	۱۲ سال بدنظمی کا زمانہ	نامعلوم		۴-ارتیا ۵-اربیانس	بدنظمی کا زمانہ مطابق بیان ہیرادتوس		
۶	کیانی	۱-کیقباد ۲-کیکاؤس ۳-کیخسرو ۴-لہراسپ ۵-گشتاسپ ۶-بہمن ۷-ہما ۸-داراب ۹-دارا	۱۲۰ سال ۱۵۰ سال ۶۰ سال ۱۲۰ سال ۶۰ سال ۱۱۲ سال ۳۲ سال ۱۲ سال ۱۲ سال	نامعلوم	قوم میڈ ایران کا شمالی مغربی علاقہ	۶-دیوکیس (دیاکو) ۷-فرارتیس (فراورتیش) ۸-سیاکزر (ہوخشتر) ۹-استاجس (وشتاسپ)	۴۰ سال ۳۲ سال ۴۰ سال ۳۵ سال	۷۰۰ ق م ۶۴۷ ق م ۶۲۵ ق م ۵۸۵ ق م	۱- محققین نے فریدوں سے لیکر کیانی بادشاہ گشتاسپ تک سب بادشاہوں کو فرضی قرار دیا ہے بعض لوگوں نے قوم میڈ کے بادشاہوں کی مطابقت شاہان مذکور سے کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس مطابقت کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔
					خاندان اخمنی ایران کا جنوبی علاقہ	۱-اکیمنیس (ہخامنش)			۲- شاہ نامہ میں جن کیانی بادشاہوں کے نام درج ہیں ان میں سے صرف تین بادشاہوں کے نام ایسے ہیں جو یونانی مورخوں کے بیان کردہ اخمنی خاندان کے تین بادشاہوں کے ناموں سے ملتے ہیں۔ یہ بلا نام بہمن ہے۔ بہمن قدیم فارسی کا لفظ

شاہنامہ کے مطابق				یونانی مورخوں کے مطابق				
نمبر شمار	نام خاندان	بادشاہوں کے نام	مدتِ حکومت	سنہ	نام خاندان یا قوم	بادشاہوں کے نام	مدتِ حکومت	سنہ	تشریح
					خاندان اخمنی یعنی علاقۂ پارس کے بادشاہ	۲۔ ٹیس پس (چائش پش)			داہومان ہے جس کے معنی ہیں بازو والا۔ یہی لفظ سنسکرت میں باہومان اسی معنی کے ساتھ ہے۔ شاہنامہ میں اس بہمن کا لقب "دراز دست" ہے۔ اس نام کی مطابقت اخمنی خاندان کے گیارویں بادشاہ آرٹاز کسس لانگی مینس (ارتخشتر دراز دست) سے ہوتی ہے۔ اسی طرح شاہنامہ کے کیانی بادشاہ داراب کی اخمنی خاندان کے تیرھویں بادشاہ ڈاریس نوتھس سے ہوتی ہے۔ اس بادشاہ کو یونانی مورخ ولد الحرام کہتے ہیں۔ شاہنامہ کا بیان بھی اس سے ملتا جلتا ہے۔ تیسری مطابقت دارا کی ہے جس نے سکندر سے مقابلہ کیا تھا۔ ان تین ناموں کی تعیین کے سوا شاہنامہ اور یونانی مورخوں کے بیانات کوئی مطابقت نہیں رکھتے۔ شاہنامہ کا بیان محض افسانہ کی حیثیت رکھتا ہے۔
						۳۔ کمبیسیس (کمبوجیہ)			
						۴۔ سائرس (کروش)			
						۵۔ کمبیسیس (کمبوجیہ)			
						۶۔ اریارمنس (اریارمنا)			
						۷۔ ارسمیس (ارتمہ)			
						۸۔ ہسٹاسپس (وشتاسپ)			
						۹۔ ڈاریس (دارایادش)			
						۱۰۔ زرکسس (شایارشا)			
						۱۱۔ آرٹازرکس لانگی مینس (ارتخشتر دراز دست)			
	بہمن دراز دست								
	لہراسپ					۱۲۔ زرکسیس ثانی (شایارشا)	۱ سال		
	داراب					۱۳۔ ڈاریس نوتھس (داراب)	۱۹ سال		
						۱۴۔ آرٹازرکسس	۴۷ سال		
						۱۵۔ آرٹازرکسس نیمن اوکس	۲ سال		
						۱۶۔ ارسیس	۲ سال		
	دارا					۱۷۔ ڈاریس کوڈومنس (دارا)			

شاہنامہ کے مطابق				یونانی مورخوں کے مطابق				
نمبر شمار	نام خاندان	بادشاہوں کے نام	مدتِ حکومت	سنہ	نام خاندان	بادشاہوں کے نام	مدتِ حکومت	سنہ	تشریح
۸	یونانی	سکندر	غیر معلوم	غیر معلوم	یونانی	۱۔ سکندر ۲۔ سلیوکس ۳۔ این ٹیوکس سوٹر ۴۔ این ٹیوکس تھیاس	۳۳۰ ق م سے تقریباً ۳۰۰ ق م تک		سکندر کے سوا کسی اور یونانی بادشاہ کا ذکر شاہنامہ یا دیگر مشرقی کتابوں میں نہیں پایا جاتا۔
۹	ملوک الطوائف	اشک وغیرہ	۰	۰	قوم پارتھیا	ارسیس	۳۰۰ ق م سے ۲۲۶ عیسوی تک		یونانیوں کے بعد خراسان کے ایرانیوں نے یونانیوں کے قبضہ کو بتدریج کیا۔ اولاً چھوٹی چھوٹی حکومتیں قایم ہوئیں اور ان سب نے مل کر یونانیوں کو علیحدہ کیا بعد میں یہ سب حکومتیں ایک ہو گئیں اور اشکانی یا اشغانی خاندانوں سے یہ حکومت منسوب ہوئی اور اُس کا پایۂ تخت شہر رے، قایم ہوا۔ ایرانی کتابوں میں ان بادشاہوں کے نام بہت مختصر درج کئے گئے ہیں اور وہ بھی اختلاف کے ساتھ۔ اسلئے اس نقشہ میں نہیں لکھے گئے۔ اشکانیہ زمانہ کئی صدیوں پر دراوی ہے لیکن ایرانی مصنفین نے اس مدت کو بھی کم کر کے دکھایا ہے۔ اس حکومت کا آخری بادشاہ اردوان تھا جس کو ساسانی خاندان کے بانی اردشیر بابکان نے علاقہ پارس (اصطخر) سے خروج کر کے شکست دی اور ساسانی شہنشاہی کی بنیاد ۲۲۶ء میں قایم کی۔
۱۰	ساسانی	اردشیر بابکان وغیرہ			ساسانی	آرٹاگزرکسس وغیرہ	۲۲۶ء سے ۶۵۲ء تک		شاہنامہ اور یونانیوں کے بیانوں میں اس خاندان سے تطبیق شروع ہو جاتی ہے۔ اس خاندان میں بیس بادشاہ ہوئے ہیں۔ آخری بادشاہ یزدگرد ثالث اہل عرب کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوا ۶۵۲ء سے عربی حکومت کا آغاز ہوا۔ عربی حکومت نے ساسانی اور یونانیوں کی سربرآوردہ خاندانوں نے بغاوت کر کے روکا۔ اور مغلوں اور دیگر قوموں نے یکے بعد دیگرے ایران کو اپنی سلطنت میں رکھا۔ اب کہیں صدیوں سے ایران میں خالص ایرانی حکومت ہے گو شاہی خاندان بدلتے رہے ہیں۔ اس میں ایرانیوں کی بنا رضا خاں پہلوی نے ڈالی ہے۔

تاریخ کی امداد سے واقعات کی جو صورت پیدا ہوتی ہے اُس میں اگر روایات اور افسانوں کے اعتبار سے قیاس کو دخل دیا جائے تو حسب ذیل نتیجے مترتب ہوتے ہیں:-

(۱) ایران میں ابتداءً تورانی قومیں آباد ہونا پائی جاتی ہیں۔ خصوصاً علاقۂ رے و آذربائجان وغیرہ میں۔

(۲) قوم میڈ سے عسوری سلطنت کا قیام عیسیٰ سے گیارہ بارہ سو سال پیشتر ہونا پایا جاتا ہے۔ اس لئے یقیناً اس سے بہت پہلے آریہ اقوام کی آمد علاقۂ میڈیا میں شروع ہوگئی ہوگی اور اس آمد کا سلسلہ بحر کاسپین کی مغربی سمت سے کوہِ قاف کے دروں میں سے جاری ہوا۔ بعض کا خیال ہے کہ یہیں سے آریہ قومیں ایران کے مشرق میں پھیل کر براہ افغانستان، پنجاب میں داخل ہوئیں۔ ورود کا زمانہ ڈیڑھ اور دو ہزار سال قبل مسیح کے درمیان سمجھنا چاہئے۔ یا اس سے بھی کچھ پہلے۔

(۳) زردشت کا عہد ۱۰۰۰ ق م کے آس پاس کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ شاہنامہ کے کیومرث و جمشید۔ کتاب آوستا کے گیومرتیا اور یم اُس زمانہ کے ہیرو ہوں جب آریہ قوم زردشت سے ہزار بارہ سو سال پہلے ایران میں داخل ہوئی۔ ہزار برس کا زمانہ سب کچھ بھلا دیتا ہے۔

(۴) ایرانیوں اور ترکوں کی لڑائیوں سے جن کا شاہنامہ میں ذکر ہے وہی جنگیں مراد ہیں جو علاقۂ رے کے رہنے والے ترکوں اور نئے آنے والے فرقوں کے درمیان واقع ہوئیں اور جن کو صدیوں بعد کی روایات نے دریائے جیحون اور دریائے سیحون کے کنارے لاکر جما دیا۔ اور اُن جنگوں سے سلسلہ ملا دیا جو بلخ کے بادشاہوں اور تاتاری اقوام کے درمیان ان دریاؤں پر ہوتی رہیں۔

(۵) چونکہ روایتی افسانوں اور بعض تاریخی حالات میں یک گونہ تطبیق پائی جاتی ہے اس لئے جہاں تک تطبیق ہوتی ہے وہ حالات افسانوں کی شخصیتوں کی ہستی کی دلیل قرار دئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً عسوری حکومت اور ضحاک کے عہد کی مطابقت۔ کیخسرو اور کروش کے حالات کی یکسانیت۔ کیکاؤس اور میڈیا کے بادشاہ سیاک زر (ہوخشتر) کے بعض واقعات کا ایک سا ہونا۔ کیقباد کا انتخاب۔ وغیرہ ایسی باتیں ہیں کہ طبیعت یہاں اٹکتی ہے اور قیاس یہ چاہتا ہے کہ قدیم روایتیں بگڑی ہوئی شکلوں میں انھیں تاریخی واقعات سے متعلق ہیں۔

ملکی حالات کا جو خاکہ پیش کیا گیا ہے اُس سے امید ہے کہ ملک ایران کی پرانی اور نئی زبانوں کی کیفیت سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ چونکہ ان زبانوں کا گہرا تعلق اُن ملکی دوروں سے ہے جن کا ذکر ابھی کیا گیا ہے اس لئے زبان کی تاریخی کیفیت بھی اُسی سلسلہ سے عرض کی جاتی ہے:- پہلے دور کی زبان کی نسبت یعنی اُس زمانہ کی زبان کے متعلق جب ہندوستان اور ایران کے آریہ فرقے ایک ہی جگہ رہتے سہتے تھے یقین کے ساتھ کچھ زیادہ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ اس قدر ظاہر ہے کہ فارسی اور سنسکرت کے الفاظ بے انتہا تعداد میں ایک ہی جگہ سے ماخوذ ہونا پائے جاتے ہیں۔ اس لئے قیاس یہ ہے کہ کم و بیش تغیر کے ساتھ قدیم فارسی یا آوستی اور ویدی زبانوں کی سی کوئی زبان متفقہ طور پر بولی جاتی ہوگی۔

اس دور کے بعد کی زبان قوم میڈ (ماہ آباد) کی زبان ہونا چاہئے۔ لیکن اس زبان کے کوئی نشانات نہیں پائے جاتے۔ اس لئے محققین صرف اس امر کے اظہار تک قانع رہے ہیں کہ کتاب آوستا کی جو زبان ہے وہ قوم میڈ ہی کی زبان ہے یا اُس سے ماخوذ ہے۔ ماہ آبادی زبان کے ساتھ ساتھ اُس زبان کا نام لیا جاتا ہے جس کو عام طور پر قدیم فارسی کا لقب دیا گیا ہے۔ اس زبان کے کئی کتبے دستیاب ہوئے ہیں جن کو پڑھ لیا گیا ہے اور جن کے معنی بھی معلوم کر لئے گئے ہیں۔ قدیم فارسی کے بعد وہ زبان رائج ہوئی جس کو پہلوی کہتے ہیں۔ اور یہی پہلوی زبان ہے جس نے عربی کی آمیزش سے فارسی حال کی شکل اختیار کر لی ہے۔ آسانی سے سمجھنے کے لئے شجرۂ ذیل ملاحظہ ہو:-

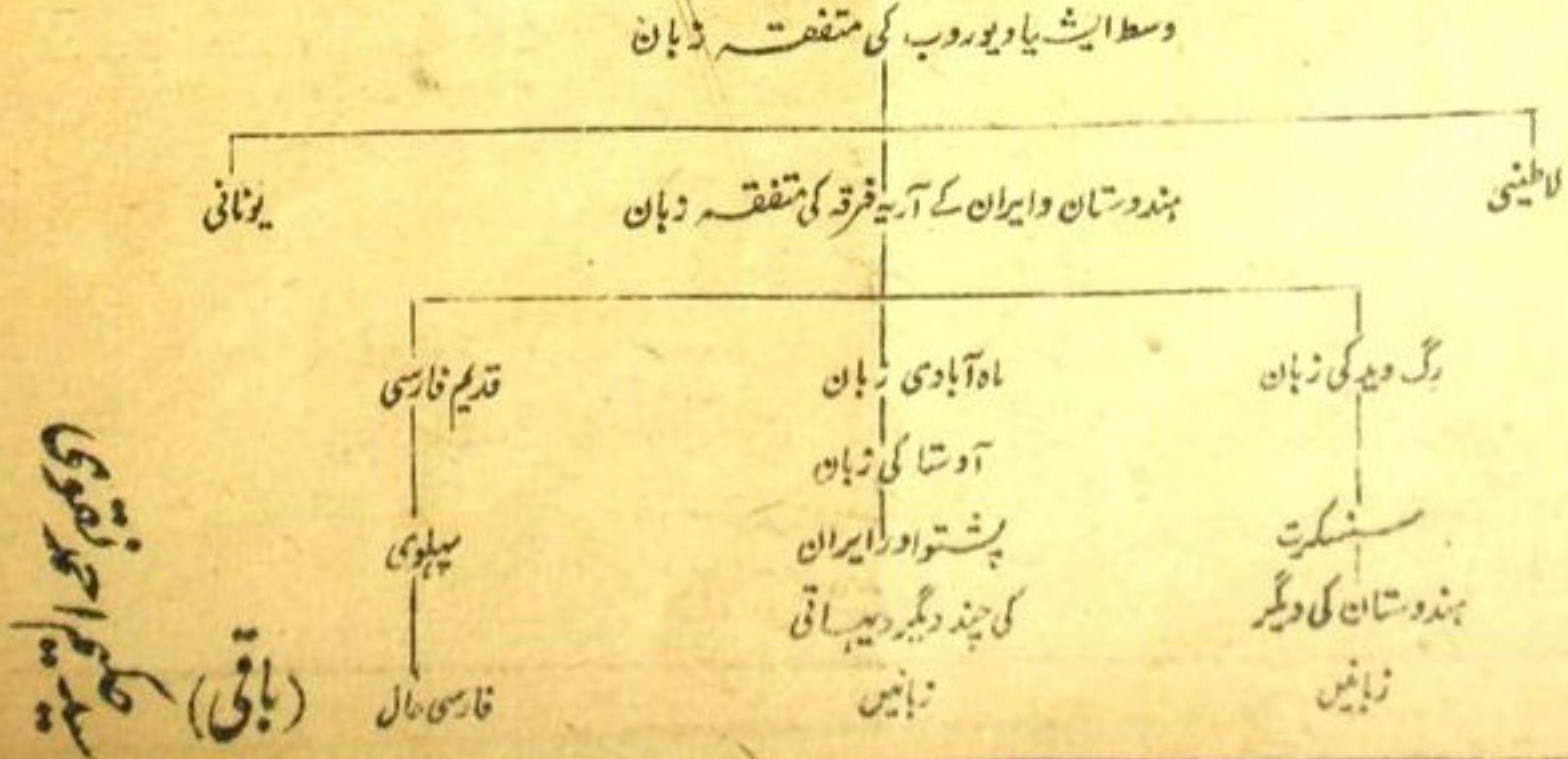

(باقی)

نئی نار نویلی

اک چھیل چھبیلی نار آئی، جوڑے میں لپیٹے ہار آئی
آنکھوں میں لئے خمار آئی پھولوں سے بھرے کنار آئی
روٹھی تھی قسم اتار آئی
آئی آئی بہار آئی

صورت گری خیال کرتی آرائشِ خدوخال کرتی
ہر نقش کو بے مثال کرتی افزوں حُسن و جمال کرتی
تابندہ و تابدار آئی،
آئی آئی بہار آئی

میخانۂ رنگ و بو میں آئی کشمیر کی آرزو میں آئی
"جھن جھن" کرتی لہو میں آئی گویا مستی نمو میں آئی
ہنگامے لئے ہزار آئی
آئی آئی بہار آئی

پھولوں کو لگاوٹیں سکھاتی غنچوں کو بغل میں گدگداتی
سوتی ہوئی خواہشیں جگاتی سسکی بھرنے پہ مسکراتی
اک آفتِ روزگار آئی
آئی آئی بہار آئی

کلیاں کھلتے جھجک رہی ہیں اندر اندر مہک رہی ہیں،
جو ڈھیٹ ہیں وہ چٹک رہی ہیں کچھ آپ ہی آپ بک رہی ہیں،
ایک ایک کو آنکھ مار آئی
آئی آئی بہار آئی

خوشبو بن کر برس گئی ہے پتی پتی میں بس گئی ہے
درّانہ گلوں میں دھنس گئی ہے آوازہ کلی پہ کس گئی ہے
بدمست و شرابخوار آئی،
آئی آئی بہار آئی،

اُڑتی ہوئی تتلیاں سنہری وہ سینے کہ جن میں رات گزری
لی باد صبا نے سانس گہری غنچوں نے سنبھالی اپنی گٹھری
رقصاں سوئے شالامار آئی
آئی آئی بہار آئی

مستی ہر شے پہ چھا رہی ہے نرگس آنکھیں لڑا رہی ہے
شبنم موتی لٹا رہی ہے لو دھوپ بھی مسکرا رہی ہے
مشاطۂ برگ و بار آئی
آئی آئی بہار آئی

وہ بادلہ پوش آبشاریں پھلی چاندی وہ جوئباریں
جھل جھل کرتی وہ مرغزاریں سیمیں بدنوں کی رہگزاریں
اک سادہ و عشوہ کار آئی
آئی آئی بہار آئی

ہر جنبشِ موج میں ترانہ پیغامِ نشاطِ جاودانہ
جیسے ہو کلامِ عاشقانہ دلکش، رنگیں، والہانہ
بربط زن و نغمہ بار آئی
آئی آئی بہار آئی

ہمت کا بلند ہمہمہ تھا گردش میں لہو کی زمزمہ تھا
دل بے ہمہ ہوتے باہمہ تھا ہر غم کا خوشی پہ خاتمہ تھا
اُس عہد کی یادگار آئی
آئی آئی بہار آئی

آیا آیا شبابِ نغمہ چھایا رنگیں سحابِ نغمہ
برسا، بنکر شرابِ نغمہ طالع ہوا آفتابِ نغمہ
یا جوگن، بین کار آئی،
آئی آئی بہار آئی

اک شوق کہ ہو گیا مجسم تکوین کے وقت جیسے عالم
اک نغمۂ سرمدی کی سرگم دل کی دھڑکن ہے جس کی محرم
بر ہمزنِ صمد قرار آئی
آئی آئی بہار آئی

نظارۂ خوش جمال رخصت گلگونہ کشِ خیال رخصت
اے دلبرِ بے مثال رخصت ہے اور مرا آل، رخصت
[illegible] غم و محن کا،
وہ میرا ہے اور میں وطن کا

(نشان بہادر) مرزا جعفر علی خاں اثر

جرمنی اور مغربی یورپ

نومبر ۱۹۱۸ء میں فرانس، برطانیہ، اٹلی اور امریکہ کی فوجوں نے پوری کامیابی حاصل کرلی تھی - بحری، بری اور فضائی مقابلوں میں انھیں نمایاں فتح ہوئی۔ جرمنی اور اس کے ساتھی پورے طور پر پسپا ہو چکے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ فتحمند قومیں ایک دائمی امن قائم کرنے کی طیاریاں کر رہی ہیں۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے صدر اعظم ولسن نے بحر اٹلانٹک کو عبور کرکے پیرس کے خوبصورت شہر میں قدم رکھا۔

رسل و رسائل اور صلح کے واقعات دُہرانے عبث ہیں۔ جمہوریت کا پیدا کیا ہوا سیاسی توازن عہدنامۂ ورسائی (Versailles Pact) کے چند دن بعد ہی قومیت کی آہنی دیواروں سے ٹکرا کر پارہ پارہ ہونا شروع ہو گیا۔ زخم خوردہ قومیت پر جمہوری آئین کا مرہم اس امید پر استعمال کیا گیا تھا کہ حکومت کی قوت عوام کے ہاتھوں میں آکر خود بخود صلح پسند ہو جائے گی۔ چنانچہ فرانس اور برطانیہ نے قیصر سے صلح کی بات چیت کرنے سے انکار کر دیا اور ویمر کے دستور العمل (Weimar Constitution.) نے بڑھے شہنشاہ کو جلاوطن کر دیا۔ بعض ملکوں میں تو کئی قوموں کو ملا کر ایک قوم بنائی گئی۔ یوگوسلیویا کی مثال سب سے زیادہ سبق آموز ہے۔ وہاں سرب کروٹ اور سلافیوں کو ملا کر ایک قوم بنا کر جمہوری آئین رائج کیا گیا۔ جب کروٹس نے مطالبہ کیا کہ ان کی قوم کا ایک الگ صوبہ بنا دیا جائے تو جمہوریت کے علمبرداروں کی طرف سے جواب ملا کہ "سرب، کروٹ اور سلافی درحقیقت ایک قوم ہیں۔ غیر ملکی سامراج نے ان کو زبردستی الگ کر رکھا تھا۔ اب جبکہ بیرونی جوا کندھوں سے اُتر گیا ہے، وحدتِ قومی کے احساس کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ قدیم جغرافیائی تقسیم جس کے ذریعہ سے غیر ملکی حکمرانوں نے قوم کو تقسیم کر دیا تھا۔ منسوخ کر دیجائے۔ اور مقامی نظم و نسق کے لئے از سر نو صوبجاتی تقسیم ہونی چاہئے تاکہ پرانے صوبوں کی حد بندیاں نسلی حلقے (Racial Groups.) نہ بنا سکیں۔[1]

لیکن خود جرمنی میں یہ غیر ملکی پودا سزاوار ثابت نہ ہو سکا۔ ہزاروں سال کے تاریخی واقعات کے خلاف جمہور کی حکومت قایم کی گئی جس کا نتیجہ سوائے تباہی و بربادی کے اور کیا ہو سکتا تھا۔ لالۂ فرانس سنگلاخِ جرمنی کے لئے نہ تھا۔ اس کی تاریخ میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ حکومت عوام کے ہاتھوں میں ہو۔ اس لئے اس آئینی ردوبدل نے ایسی رجعت پسندی پیدا کر دی کہ حکومت اور سلطنت دونوں کا نظریہ ہی بدل گیا۔ سیاسی مرکز فرد سے ہٹلر قوم میں پہونچ گیا اور جرمنی کا احیاء افراد سے نہیں بلکہ قوم سے وابستہ ہو گیا اور قومیت کی روح نے ہٹلر میں جنم لیا۔

اس نئے روپ میں جرمنی کو اس کا کھویا ہوا قیصر مل گیا۔ جس کی انھیں مدتوں سے تلاش تھی۔ ہر اسٹیفان لورانیٹ اپنی شہرۂ آفاق کتاب میں لکھتا ہے کہ:-

"جرمن باشندے جنگ، تکبر، بے روزگاری، بھوک اور مفلسی و لاچاری سے پست ہو گئے تھے۔ ان کا مستقبل تاریک تھا — کہ ایک شخص شعاعِ امید لیکر اُٹھتا ہے۔ وہ اُن کو یقین اور اعتبار کی تعلیم دیتا ہے — ایک شخص، جو شاندار مستقبل کا وعدہ کرتا ہے، کہتا ہے کہ "اس وقت نہ کوئی بے روزگاری ہوگی، نہ کوئی بھوکا رہے گا اور نہ کوئی تکلیف باقی رہے گی"۔ اُنھوں نے فوراً اس شخص کی رہبری قبول کر لی ..... ! ایک مسیح کے لئے یہ وقت سازگار تھا — خواہ وہ جھوٹا ہی کیوں نہ ہو"

مگر اس نئے دیوتا کو اپنی بقا کی تلاش ہوئی اور اس کی بقا کے لئے تصادم ضروری تھا۔ موجودہ جنگ کی سب سے اہم وجہ یہی ہے۔ ہٹلر کا مقصد اقتصادی آزادی نہیں، سیاسی توازن نہیں بلکہ صرف عالمگیر قوت حاصل کرنا تھا۔ چنانچہ ہٹلر نے برسرِ اقتدار آتے ہی وطنیت کے تخیل کو اس قدر سنگین بنا دیا کہ اس میں روحانیت کے لئے کوئی جگہ نہ رہی

---

[1] اے۔ ایچ۔ مارے۔ "یوروپ کا نیا جمہوری آئین"

ہٹلر کے برسرِ اقتدار آتے ہی لوگوں نے سمجھا کہ وہ مشرق میں پھیلنا چاہتا ہے اور مغرب کی جانب کسی کا خیال بھولے سے نہیں گیا حالانکہ شروع ہی سے ہٹلر فرانس کی خارجی پالیسی کی سخت مذمت کرتا رہا تھا۔

ہٹلر کے عزائم کے متعلق لوگوں کا خیال تھا کہ وہ مشرقی یورپ میں اقتدار حاصل کرنے کے لئے یہ سب کچھ کر رہا ہے اور مغربی ممالک میں اس کا مقصود فرانس برطانیہ اور اٹلی کو غیر جانبدار رکھنا ہے، لیکن یہ خیال صحیح نہ تھا۔

مائن کمپف میں وہ صاف صاف لکھتا ہے کہ[1] "فرانس ہمارا زبردست ترین ناقابل معافی دشمن ہے اس کے باشندے سخت مکار ہیں اور ان کا مقصد دنیا میں یہودیوں کا اقتدار قایم کرنا ہے جو یورپ کی سفید نسل کے لئے ایک دل دہلا دینے والا خطرہ ہے۔

اُسکے ایک صفحہ پہلے وہ نہایت کھلے ہوئے الفاظ میں تحریر کرتا ہے کہ "جرمن باشندوں کا سنگین ترین دشمن فرانس ہے، خواہ وہاں کوئی بھی پارٹی برسرِ اقتدار کیوں نہ ہو"

مذکورۂ بالا بیانات سے جو ہٹلر کی دلی خواہشات کی آئینہ دار ہیں، صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فرانس کا سخت دشمن تھا۔ فرانس کا اعلیٰ فوجی نظام، رہائن پر فرانس کا اقتدار اور خود فرانس کی اندرونی سیاست میں یہودیوں اور اشتراکیوں کا غلبہ ہٹلر کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا۔

اس کی نظر میں فرانس ہی معاہدۂ ورسائی کا ذمہ دار تھا۔ اور اسی وجہ سے وہ برطانیہ سے زیادہ فرانس سے خار کھائے بیٹھا تھا۔ بعد میں جب وہ چانسلر منتخب ہوگیا تو فرانس ہی نے جرمنی کے خارجی اُمور میں مداخلت کرنا چاہی اور بارتھو (Barthou) کی زیرِ قیادت ہمیشہ جرمنی کی مسموم پالیسی کو روکنے کی کوشش کرتے رہے۔ یہی نہیں بلکہ جب کبھی ہٹلر نے معاہدہ کی شرط سے انحراف کیا تو ہمیشہ فرانس نے اس پر جوابی قدم اُٹھانے کی دھمکی دی۔ علاوہ اس کے اُنھوں نے روس سے بھی ایک عمرانی معاہدہ کیا جو ہٹلر کی دائمی پریشانی کا باعث تھا۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہٹلر نے سب سے پہلے فرانس کو ختم کرنے کی تدبیریں شروع کر دیں۔

• ان حالات کے پیشِ نظر یہ تصور کرنا کہ ہٹلر فرانس سے دائمی صلح چاہتا تھا یا زیادہ سے زیادہ اسے غیر جانبدار رکھنا چاہتا تھا۔ غلطی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ اس نے مغرب کی طرف اُسوقت تک قدم نہیں اُٹھایا جب تک کہ مشرق کی طرف سے مطمئن نہیں ہوگیا۔

ہٹلر کو شروع ہی سے اس بات کا احساس تھا کہ اگر جرمنی کسی طرف اقدام کرتا ہے تو فرانس جوابی و عقبی حملہ کر دے گا۔ کیونکہ فرانس کا رشتۂ اتحاد تقریباً یورپ کے ہر ملک سے استوار تھا اور اس کے معاہدات ہرگز ہرگز جرمنی کو ناجائز فایدہ اُٹھانے کی اجازت نہیں دیتے تھے ــــ ہٹلر مشرق کی طرف دیکھتا، جنوب کی طرف دیکھتا، بالٹک کی طرف دیکھتا حتیٰ کہ سمندر پار کے ممالک پر للچائی ہوئی نگاہیں ڈالتا اور ہر جگہ اسے فرانس سپر کی مانند اس ملک کی محافظت پر آمادہ نظر آتا۔ چنانچہ اس کا خیال تھا کہ جب تک وہ فرانس کو تباہ و برباد نہ کر دے گا اس وقت تک اس کے مقاصد پورے نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ اسی خیال کے ماتحت ۱۰ مئی ۱۹۴۰ء کو نازی انجن، ہالینڈ، بلجیم اور لکسمبرگ کی پُرفضا اور سرسبز وادیوں سے ہوتا ہوا جنھیں ہٹلر کی دیرینہ خواہشات اور روزنبرگ کے تباہ کُن ہمہ گیر اور خیالی نقشے کے مطابق نازی یونین میں شامل رہنا چاہئے تھا، فرانس کے سبزہ زاروں پر پھیل گیا!

اسپین و اٹلی خارجی پالیسی کی موافقت کی وجہ سے اٹلی و جرمنی کا رشتۂ اتحاد کافی استوار ہوگیا تھا۔ اِدھر مسولینی نے ہٹلر کو معاہدات کی شرائط توڑنے میں کافی مدد دی، اُدھر جرمنی نے اٹلی کی فتح حبشہ کو تسلیم کر لیا۔

کاونٹ چیانو (Count Ciano) کی سفارتِ برلن کے بعد دونوں کے تعلقات اور مضبوط ہوگئے۔ اسپین میں بغاوت کی آگ بھڑک چکی تھی۔ محوری طاقتیں اس بغاوت کو فروغ دینے کے لئے پسِ پردہ پوری کوششیں کر رہی تھیں۔ ہٹلر، فرینکو کا پشت پناہ بن چکا تھا۔ چنانچہ جب بغاوت کامیاب ہوئی اور جنرل فرینکو نے میڈرڈ میں فاتحانہ قدم رکھا تو اس کے فوراً ہی بعد جرمنی اور اٹلی دونوں نے ایک متحدہ اعلان کرتے ہوئے اسپین میں اس کی حکومت کو جائز قرار دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسپین بھی (National Socialism) کا مرہون منت ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور فرینکو ظاہری غیر جانبداری کے

---

[1] اسٹیفن ایچ. رابرٹس ــ "ہٹلر کا تعمیر کردہ مکان" (صفحہ ۳۴۳)

باوجود ہٹلر کا آلۂ کار بن گیا۔

خود جرمنی اور اٹلی کے تعلقات پہلے تو برابری کے رہے اس کے بعد رفتہ رفتہ ہٹلر، اٹلی پر اپنی گرفت مضبوط کرتا گیا۔ یہاں تک کہ اٹلی کا تجارتی کاروبار بھی جرمن نمایندوں کے ہاتھ میں آگیا اور اب اٹلی کے ہر فرم، ہر مل یہاں تک کہ پولیس کا انتظام اور شہروں میں بھی جرمن سپاہی امن و امان قایم رکھنے کے لئے نظر آتے ہیں۔ ان آئینی چالوں سے ہٹلر نے اپنے ایک زبردست حامی کو بھی ایک ادنیٰ غلام بنالیا۔

ہٹلر کے تمام مقبوضات یورپ میں فرانس کی حالت سب سے زیادہ اندوہناک ہے۔ گزشتہ چند سالوں میں اس بدقسمت فرانسیسی قوم کو کتنے مصائب برداشت کرنا پڑے ہیں! انھیں کس خطرناک اور مایوس کن راستوں پر چلنا پڑا ہے۔ کتنی مرتبہ اس نے اپنے اعتبار کی زمام مختلف رہنماؤں کے ہاتھ میں دی ہے اور کتنی مرتبہ اسکو ناامیدی ہوئی ہے۔ ڈیلیڈیا ور ینال کی داستانِ غم طاقِ نسیاں پر رکھی جاچکی ہے۔ اب وہ افسانے خواب و خیال ہوچکے ہیں۔ مارشل پیتان کے کارنامے کچھ دنوں تک سرگرم رہے لیکن جرمن مظالم نے بڈھے جنرل کو بھی فرانس کی عنانِ حکومت جرمنی کے طرفدار لاوال کے ہاتھ میں دے دینے پر مجبور کردیا۔

لاوال نے برسرِ اقتدار آتے ہی اعلان کیا کہ وہ فرانس کو تباہی و بربادی کے محیط غاروں کی طرف نہیں لے جائے گا بلکہ وہ جرمنی سے رشتۂ اتحاد استوار کرکے کام کرے گا۔ لاوال کی بھیک سے شاید جرمن سامراج پر کچھ اثر پڑے۔ لیکن ہٹلر اپنے ارادوں سے کیسے انحراف کرسکتا ہے۔ وہ اپنے الفاظ کہ "فرانس ہمارا سنگین ترین دشمن ہے خواہ وہاں کوئی بھی پارٹی برسرِ اقتدار کیوں نہ ہو" کیسے بدل سکتا ہے۔ پرانی دشمنی چند ہی دنوں میں خوشگوار تعلقات سے کیسے تبدیل کی جاسکتی ہے جنگ کے شروع میں ہٹلر نے روس سے بھی ایک تحفظاتی معاہدہ کیا تھا، لیکن اس معاہدہ کا جو حشر ہوا ظاہر ہے ــــ امریکہ، برطانیہ اور اتحادیوں نے اس راز کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیا ہے۔ اس لئے انھوں نے فرانسیسی مقبوضات کو اپنی نگرانی میں لے لیا ہے تاکہ محوری طاقتیں ان سے فایدہ نہ اُٹھا سکیں۔ مڈغاسکر اور مارٹینک (Martinique) کی سبق آموز مثال ہمارے سامنے ہے۔

کچھ دنوں سے ہٹلر کی دیرینہ خواہشات پوری کرنے اور فرانس کی رہی سہی آبرو تباہ کرنے کے لئے مارشل گورنگ پیرس میں مصروفِ کار ہیں! لیکن آزاد فرانسیسی طاقت بھی ساتھ ہی ساتھ بڑھ رہی ہے۔ جنرل ڈیگال نے حال ہی میں اعلان کیا ہے کہ "فرانس نے اپنا راستہ تجویز کرلیا ہے اور وہ راستہ آزادی اور فتح کی طرف رہنمائی کرتا ہے"۔

اصغر عثمانی

دی مغل لائن لمیٹڈ

مسلمانوں کی قایم کی ہوئی واحد جہاز ران کمپنی

تھوڑے تھوڑے وقفہ سے بمبئی اور کراچی سے عدن اور پورٹ سوڈان، جدّہ اور سویز تک جہازوں کی روانگی کا معقول انتظام

سفری اور باربرداری کے جہازات بمبئی اور کراچی سے عدن۔ پورٹ سوڈان۔ جدّہ اور سویز تک

مسافر اور مال و اسباب لیجاتے ہیں، نیز بمبئی اور کراچی سے پورٹ لوئی اور ماریشس تک سفر کرتے ہیں

تمام سروسیں اور تاریخیں بغیر کسی پیشگی اطلاع کے منسوخ کیجا سکتی ہیں

مزید تفصیلات کے لئے لکھئے:۔ ٹرنر مارسین ۔ اینڈ کمپنی لمیٹڈ ۱۶ ۔ بنک اسٹریٹ ۔ بمبئی

نگاہ بازگشت

(بہ سلسلۂ ماہ دسمبر ۴۱ء)

اس عنوان سے جنوری ۴۱ء کے نگار پر جناب علی سجاد قہر اکبرآبادی کا تبصرہ ماہ جولائی ۴۱ء کے نگار سے شایع ہونا شروع ہوا تھا جو دسمبر ۴۱ء تک جاری رہا، لیکن اس مضمون کا کچھ حصہ باقی تھا کہ جنوری ۴۲ء کے انتقاد نمبر کی اشاعت کا وقت آگیا اور اس طرح اس مضمون کا باقی حصہ شایع ہونے سے رہ گیا۔

اب اس اشاعت میں ہم اس حصہ کو تمام و کمال شایع کئے دیتے ہیں تاکہ ایک اور مکمل تبصرہ قارئین نگار کے سامنے آجائے۔ نیاز

۲۷- نوح ناروی

حضرتِ نوح ناروی ایک کہنہ مشق غزل گو شاعر اور داغ دہلوی کے شاگرد ہیں۔ آپ کی شاعری پرانے دور کی شاعری کی یادگار اور آپ کا رنگِ سخن تقلید و اتباع کا نمونہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آپ کے کلام میں فرسودہ اور پامال مضامین حسن و عشق کی کثرت ہے مگر سادگیِ بیان اور محاورات کا برمحل استعمال آپ کی وہ خصوصیات ہیں جو آپ کو دوسرے شعراء سے الگ کرتی ہیں۔ آپ نے اپنے اس رنگِ شاعری میں اس قدر پختگی حاصل کرلی ہے کہ ہم آپ کے شعر سننے کے بعد یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ حضرتِ نوح کی آواز ہے۔

حضرتِ نوح کی شاعری کی ایک اور بڑی خصوصیت یہ ہے کہ آپ عموماً مختلف فعلوں کے اجتماع سے ایک مصرع پورا کرلیتے۔ مثلاً:-

دکھائے پانچ عالم اک پیامِ شوق نے مجھ کو — اُلجھنا۔ روٹھنا۔ لڑنا۔ بگڑنا۔ دور ہو جانا

آپ کے یہاں تکرارِ الفاظ بھی ہے لیکن اس میں آورد نہیں بلکہ روزمرہ کے ساتھ کلام شعر میں بے ساختہ پن پیدا ہو جاتا ہے۔ جیسے:-

اسیرانِ قفس کو واسطہ کیا ان جھمیلوں سے — چمن میں کب خزاں آئی چمن میں کب بہار آئی

یہ میں تسلیم کرتا ہوں کہ تم کو اُس سے نفرت ہے — مگر اتنا سمجھ رکھو۔ محبت پھر محبت ہے

اور تو ہم نے کچھ بھی نہ جانا لیکن اتنا جان گئے — دُنیا میں نادان آئے۔ نادان رہے۔ نادان گئے

غرقِ بحرِ ستم نہ کیوں ہوں۔ یہ جانفشانی ہے اور ہم ہیں — کہ آپ ہیں۔ آپ کی چھُری ہے۔ چھُری کا پانی ہے اور ہم ہیں

وادیِ اُلفت میں دیکھی ہم نے کب منزل کی شکل — گر پڑے۔ گر کر اُٹھے۔ اُٹھ کر سنبھلتے ہی رہے

نکھر آئی۔ نکھار آئی۔ سنور آئی۔ سنوار آئی — گلوں کی زندگی لیکر گلستاں میں بہار آئی

ان چند مثالوں سے نوح کے مخصوص رنگِ سخن کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ سادگی میں جناب نوح نے اپنی مشاقی کی بدولت اس قدر عبور حاصل کرلیا ہے کہ آپ نازک سے نازک جذبات اور بلند سے بلند مضمون کو نہایت سادگی و بے ساختگی سے نظم کر جاتے ہیں۔ جیسے:-

کچھ نہ کہنا بھی کسی کے سامنے — اِک طرح کا انکشافِ راز ہے

کیونکر بسر ہوئی شبِ فرقت نہ پوچھئے — سب مجھ سے پوچھئے یہ مصیبت نہ پوچھئے

کعبہ یہی ہے۔ دیر یہی۔ طور بھی یہی — اس بے دلی سے دل کی حقیقت نہ پوچھئے

ہوگئیں ختم ہجر کی گھڑیاں — اور تھوڑی سی رات باقی ہے

ہم بڑی دیر سے یہ دیکھتے ہیں — اس طرف کوئی دیکھتا بھی نہیں

آپ کے یہاں توالی اضافت۔ غیر مانوس تراکیب اور پیچ در پیچ تشبیہات و استعارات نہیں پائے جاتے۔ آپ کی شاعری نہایت سادگی اور روانی لئے ہوئے ہے اور اس میں کہیں کہیں محاورہ کا استعمال چار چاند لگا دیتا ہے

۲۸- وحشت کلکتوی

جناب وحشت کلکتوی مشاق سخن گو ہیں۔ مگر آپ کے کلام میں اساتذۂ فن کی سی پختگی نہیں پائی جاتی۔ آپ نے اپنے تغزل میں غالب کا رنگِ سخن اختیار کیا ہے اور اس پر فخر کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے سوانح حیات میں بھی (جو نہایت مختصر ہیں) اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ "بقول مولانا حالی حقیر نے تتبع غالب کا حق ادا کیا"۔ آپ نے اپنے اشعار میں فارسی الفاظ و فارسی تراکیب بکثرت استعمال کی ہیں لیکن یہ غنیمت ہے کہ مہمل نہیں ہیں۔ البتہ کہیں کہیں ایسی مثالیں ملتی ہیں جو شعر کے اثر کو کم کر دیتی ہیں۔ اور لہجۂ تغزل کے منافی ہیں۔ مثلاً:-

دلِ آشفتہ کو گم گشتۂ کوئے وفا پایا — سرِ شوریدہ کو منت گزارِ سنگِ در دیکھا

اندیشۂ سود و زیاں زنجیر پائے شوق ہے — کچھ جذبۂ دل کی بھی سن۔ اے عقل خودداری نہ کر

فقط بیگانۂ خوئی ہی نہیں ہے شانِ محبوبی، — کتاب آشنائی دیکھ اٹھا کر طاقِ نسیاں سے

غزل کے شعر میں جو لطافت و کیفیت ہونی چاہئے اس سے یہ اشعار خالی ہیں۔ اس قسم کی مثالیں ہمیں اور بھی جناب وحشت کے کلام میں ملتی ہیں۔ کہیں تقلیداً جناب وحشت نے اپنے محبوب کے خارجی اوصاف بھی بیان فرمائے ہیں مگر طرزِ ادا میں وہی فارسیت نمایاں ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو:-

نرگسِ مستانہ میں کیفیتِ جامِ شراب — قامتِ رعنا پہ عالم مصرعِ اُستاد کا،

آنکھوں نے تیری ہوش اُڑائے شراب کے — چھونے نے تیرے بات بگاڑی بہار کی

کہیں کہیں آپ کے کلام میں مخصوص لکھنوی رنگِ تغزل بھی نمایاں ہے۔ جیسے:-

سرہانے تم آجاؤ ذرا بیمارِ ہجراں کے — کہ اک ہچکی میں وہ کہدے کہانی زندگی بھر کی

تہ مرقد قرار آئے گا کیونکر مرنے والوں کو — جو تم کو دوستوں کا غم نصیبِ دشمناں ہوگا

پھر ہوا میرے لئے شوق آفریں اُس کا شباب — پھر مرا دل عہدِ پیری میں جواں ہونے لگا

ہے نظر بازوں میں ہلچل سب ہیں گرمِ جستجو — وہ پری ہے کون وحشت جس کا دیوانہ ہوا

جنوں انگیزیاں بڑھتی چلی ہیں اُس کے گیسو کی — بہت سے ہاتھ اب صرفِ گریباں ہوتے جاتے ہیں

بزمِ اغیار میں معذور نہ تھے وہ وحشت — بات اگر کر نہیں سکتے تھے اشارا کرتے

جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ آئے ہیں جناب وحشت کو فارسی الفاظ و تراکیب کے استعمال کا بہت ذوق ہے اور اُن کے اس شوق نے اُنھیں اس جگہ بھی فارسی لفظ سے احتراز نہ کرنے دیا جہاں وہ اُردو کا ایک سیدھا سادا لفظ استعمال کر سکتے تھے۔ مثلاً:-

جو حق پوچھو۔ کتابِ آرزو کا حرفِ باطل ہوں — مٹا دیں کیوں نہ وہ مجھکو مٹا دینے کے قابل ہوں

اس شعر کے مصرعۂ اولےٰ میں "حق" کے بجائے اگر "سچ" نظم کرتے تو زیادہ مناسب تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ جناب وحشت کے مفہوم میں بھی کوئی فرق نہ ہوتا۔ آپکا ایک شعر ہے

عجب حسرت فزا ہوتی ہیں وہ شبہائے تنہائی — کہ میں ہوتا ہوں اور میرا دلِ ناشاد ہوتا ہے

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں آورد ہے۔ وہ بہ آسانی یوں نظم ہو سکتا تھا:- "عجب حسرت فضا ہوتی ہیں تنہائی کی وہ راتیں"

رہی یک چند نقشِ آرزو کی دل میں رنگینی — وہ اک بیکار سی تحریر تھی میں نے مٹا ڈالی

اس شعر کے بھی مصرعۂ اولےٰ میں "یک چند" کی ترکیب "وہی یک نفس بیش نہیں" غالبیت کے تتبع و پیروی کا نتیجہ ہے۔ یہ مصرعہ یوں بھی نظم ہو سکتا تھا کہ:-

رہی کچھ دیر نقشِ آرزو کی دل میں رنگینی

کہیں کہیں جناب وحشت کے یہاں زبان و بیان کی غلطیاں بھی پائی جاتی ہیں اور اُن کے بعض بعض اشعار میں ہمیں غلط محاورے اور حشو وغیرہ کی مثالیں ملتی ہیں۔

جیسے کسی شعر میں "ہائے وائے" "ہے ہے" وغیرہ کہکر مصرعہ کو پورا کیا گیا ہے۔ مثلاً:-

سادہ دل کتنے ہیں ارباب محبت ہے ہے — کہ تیرے عشوۂ پنہاں کو حیا کہتے ہیں

حسرتوں کا ہائے رے دل میں ہجوم — آرزؤں کا نتیجہ دیکھئے

"ہے ہے" اور "ہائے ہائے" یہ شعر کو پورا کرنے کے لئے استعمال کئے گئے ہیں ورنہ ان کے بغیر بھی شعر کا مفہوم پورا ہو سکتا تھا۔ دوسرے شعر کا مصرعۂ ثانی اگر یوں نظم کرتے کہ:- "حسرتوں کا میرے دل میں وہ ہجوم" تو "ہائے رے" کا نامناسب ٹکڑا نکل جاتا۔ ایک شعر ہے:-

اُس انجمن میں کہ بہتی ہو بیخودی کی شراب — وہ ہوشیار نہیں ہے جو ہوشیار نہیں

اس شعر کا مصرعۂ اولےٰ لفظ "جہاں" کی ضرورت کو محسوس کر رہا ہے پہلے مصرعہ کی اگر نثر کیجائے تو یوں ہوگی کہ "اُس انجمن میں کہ بیخودی کی شراب بہتی ہو۔ اور اس سے مفہوم واضح نہیں ہوتا جب تک کہ لفظ "جہاں" نہ صرف کیا جائے جیسے "اُس انجمن میں کہ جہاں بیخودی کی شراب بہتی ہو"۔ اور یہ ادائے بیان کی ایک خامی ہے

مرے گریۂ الم پر نہ بہائیں جائیں آنسو — کہیں تم ہنسی نہ کرنا مری چشم خونفشاں کی

غالباً جناب وحشت نے "ہنسی نہ اُڑانا"۔ یا "ہنسی نہ کرانا" کے مفہوم میں "ہنسی نہ کرنا" استعمال ہے جو غلط ہے۔ ہنسی اُڑانا۔ ہنسی کرانا۔ محاورہ ہے مگر ہنسی کرنا یہاں محاورے کے خلاف ہے اور غیر فصیح ہے۔

نہ پردا کی ہماری کارواں نے جب تو پھر ہم بھی — بچھڑ کر کارواں سے کیا تلاشِ کارواں کرتے

اس شعر میں "کارواں" اور "ہماری" ایسے متصل ہو گئے ہیں کہ "ہماری کارواں" پڑھا جاتا ہے اور یہ نشستِ الفاظ کی ایک بڑی خرابی ہے۔

ہر چند کہ جناب وحشت کے کلام میں سوز و گداز اور اثر آفرینی بہت ہی کم پائی جاتی ہے مگر پھر بھی آپ کے یہاں تغزل کے عمدہ نمونے نظر آجاتے ہیں۔ جیسے:-

معاذ اللہ اتنی ناامیدی — کہے گی وہ نگاہِ آشنا کیا

مجالِ ترکِ محبت نہ ایک بار ہوئی — خیالِ ترکِ محبت تو بار بار آیا

ہمارے آگے سے وہ جب کبھی گزرتے ہیں — ہم اپنے کھوئے ہوئے دل کو یاد کرتے ہیں

وہ آئیں یا نہ آئیں انھیں اختیار ہے — اے ذوقِ انتظار میں خوش ہوں کہ تو تو ہے

ابھی تو تیری مایوسی سے اطمینان ہے اے دل — مجھے اسوقت ہوگا خوف جب تو شادماں ہوگا

کسی سے کہتی ہے چتون کسی کی — کہ تو کیا اور تیرا مدعا کیا

آپ اپنا روئے زیبا دیکھئے — یا مجھے محوِ تماشا دیکھئے

مزا آتا اگر گزری ہوئی باتوں کا افسانہ — کہیں سے ہم بیاں کرتے کہیں سے تم بیاں کرتے

۲۹- یگانہ چنگیزی

جناب یگانہ لکھنوی اب سے کچھ قبل "یاس عظیم آبادی" تھے مگر لکھنؤ کی آب و ہوا اور رنگا رنگ دلچسپیوں نے ان پر کچھ ایسا اثر کیا کہ یہیں کے ہو رہے اور وہیں شادی بھی ہوئی۔ پہلے یاس تخلص کرتے تھے اب یگانہ تخلص کرتے ہیں۔ آپ ہندوستان کے ممتاز شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے اشعار کا انتخاب نہایت بیدلی سے کیا ہے۔ نیز آپ کا انتخاب بہ نسبت اور دیگر شعراء کے مختصر بھی ہے۔ یعنی آپ نے صرف ۱۴ غزلوں میں سے اپنے اشعار کا انتخاب کیا ہے۔ مگر پھر بھی یہ مختصر انتخابِ کلام آپ کے رنگِ شاعری کو سمجھنے میں مساعدت کرتا ہے۔

جناب یگانہ کی شاعری لکھنوی رنگِ تغزل کی یاسیت و مرثیت کے خلاف ایک آواز کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ نے اپنے زمانہ کے مروجہ رقتی اسکولِ شاعری سے انحراف کیا اسی لئے وہ عجز و افتادگی جو ان کے ہمعصر لکھنوی شعراء کا طرۂ امتیاز بھی ان کے یہاں نہیں پائی جاتی۔ آپ کے یہاں مشاہدۂ حُسن اور احساس عشق ضرور ہے مگر جذبات کا کھلنڈرا پن نہیں۔ آپ کے یہاں محرومی و مہجوری کی داستانیں نہ ملیں گی۔ آپ کے احساسِ عشق میں ایک خودداری و خودی کی جھلک نمایاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے کلام میں سوز و گداز کی کیفیات کا عنصر بہت ہی کم ہے۔ مگر ایک شخص جناب یگانہ کے شعر سُنکر اپنے آپ کو اُن میں گم کر سکتا

ہے ۔ آپ کے عشق کا تصور ہمارے دوسرے بعض شعراء کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ آپ کے لہجہ میں ایک جرأت رندانہ ہے۔ آپ کے اشعار کا لب و لہجہ اور تیکھا پن ملاحظہ ہو:۔

ہاں! کیوں نہ پار اُتر چلوں خمیازہ جھیلکر — ڈوبے مری بلا عرقِ انفعال میں ،
گنہگارِ محبت کو اسی عالم میں رہنے دے — سزا واجب سہی لیکن بہشتِ جاوداں کیوں ہو

تمکنت و خودداری ملاحظہ ہو:۔

نہ سُنا ہوگا راگ فطرت کا — جانتے ہو مری صدا کیا ہے
یگانہ فکر حاصل کیا۔ تم اپنا حق ادا کردو — بلا سے تلخ گزرے زندگانی رائگاں کیوں ہو

ان کے اشعار میں ایک طرح کی قوت و تازگی ہوتی ہے ۔ جیسے:۔

نگاہِ شوق سے کیا کیا گلوں کا دل دھڑکتا ہے — مبادا رنگ و بو اڑ جائے پامالِ نظر ہوکر
پیدا نہ ہو زمیں سے نیا آسماں کوئی ، — دل کانپتا ہے آپ کی رفتار دیکھ کر
نگاہِ شوق کی دُنیا خدا جانے کہاں تک ہے — جہاں دیکھا وہی حُسنِ یگانہ شمع محفل تھا

آپ کے رنگِ تغزل کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:۔

خوشی میں اپنے قدم چوم لوں تو زیبا ہے — وہ لغزشوں پہ مری مسکرائے ہیں کیا کیا
آوازِ بازگشت پہ کیا دیتے ہو صدا — کس سے اُلجھ رہے ہو جواب و سوال میں
کرے گا پرورش نخلِ آرزو کے دن — وہ بدنصیب جسے ذوقِ انتظار نہیں
کیوں انقلابِ عشق یہ کیسی ہوا چلی — جی سن سے ہو گیا رُخِ بیمار دیکھکر
کوئی ناگفتنی مطلب ہے ان نیچی نگاہوں کا — زباں تک آ نہیں سکتا تو آنکھوں سے بیاں کیوں ہو
غیرت سے رنگِ نامۂ اعمال اُڑ نہ جائے — کیفیتِ نگاہِ گنہگار دیکھکر
کیسے کیسے خدا بنا ڈالے — کھیل بندے کا ہے خدا کیا ہے
بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے — وہ بدنصیب جسے بخت نارسا نہ ملا
گناہ زندہ دلی کہئے یا دل آزاری — کسی پہ ہنس لئے اتنا کہ پھر نہ سکا نہ گیا
سمجھتے کیا تھے مگر سنتے تھے ترا نۂ درد — سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سُنا نہ گیا

۳۰۔ آزاد انصاری

جناب الطاف احمد صاحب آزاد انصاری ایک کہنہ مشق شاعر اور مولانا حالی مرحوم کے شاگرد ہیں۔ آپ کے رنگِ سخن کو الحاظ سادگی اپنے اُستاد کی شاعری سے غایت درجہ مناسبت ہے۔ ان کے کلام میں تغزل کے قدیم رنگ کا پتہ نہیں ملتا۔ اور آپ کے یہاں محبوب کے ظلم و ستم کی شکایتیں۔ مقتل و خنجر کے مضامین۔ ہجر کی مجبوریاں اور وصل کی کامرانیاں قطعی نہیں ملیں گی۔ ہر چند کہ آپ کے کلام میں تغزل بدرجہ اتم موجود ہے مگر ان سب دعریاں مضامین سے بری۔ آپ کا تغزل آپ کے دلی جذبات و قلبی تاثرات کا عکس ہے۔ زبان کی صفائی، اندازِ بیان کی بے ساختگی۔ تکرارِ الفاظ۔ اور مناسب تراکیب۔ آپ کی شاعری کی خصوصیات ہیں۔ چھوٹی چھوٹی بحروں میں بڑے بڑے مضامین کو نہایت سادگی سے ادا کر جاتے ہیں اور آپ کا طرزِ بیان اس میں کچھ نہ کچھ جدت کا پہلو لئے ہوئے ہوتا ہے۔

طبیعت ہی درد آشنا ہو گئی — دوا کا نہ کرنا دوا ہو گیا ،
الٰہی کامیابی رہنما ہو — کوئی امید وار نہ چلا ہے
اب فریبِ مہربانی رائگاں — زندگی بھر کو نصیحت ہو گئی
میں تو اظہارِ درد کرتا ہوں — کوئی درد آشنا نہیں نہ سہی

خیالِ نگاہِ محبت عبث، کتابِ نگاہِ محبت کہاں

مندرجۂ بالا سب اشعار صحیح تغزل کا نمونہ اور سادگی و طرزِ ادا کے لحاظ سے نہایت پر لطف ہیں۔ کہیں کہیں لہجہ کا سکون اور دھیما پن شعر کے اثر کو دوبالا کر رہا ہے اور شاعر کی ادائے بیان کی قدرت کا غماز ہے۔ اور بعض بعض اشعار میں طنز کی ایک ہلکی سی چاشنی شعر کو بہت پر کیف بنائے دے رہی ہے۔

جناب آزاد انصاری کی ایک اور اہم خصوصیت اِن کے کلام میں 'مماثل ترکیب' کا نہایت خوبی کے ساتھ پایا جانا ہے۔ اور یہی چند چھوٹے چھوٹے ٹکڑے شعر میں نہایت زور و اثر پیدا کر دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

اِک وہ ہیں کہ بے خوف و خطر گرم شکایات — اک ہم ہیں کہ اظہارِ تمنا نہیں ہوتا

تم اور چارۂ غمِ فرقت۔ خوشا نصیب — دکھ کو دوا نصیب۔ مرض کو شفا نصیب

تو۔ اور پاسِ خاطرِ اہلِ وفا کرے — امید تو نہیں ہے۔ مگر ہاں! خدا کرے

تدبیر کیا ہے آپ کی جانب سے حکم کار — تقدیر کیا ہے؟ آپ کا منشاء کہیں جسے

کرم ہیں اور طلب سے بھی زیادہ — ستم ہے اور یہ اندازِ دگر ہے،

تم۔ اور دل آزاریٔ اربابِ محبت — اربابِ محبت کا یہ شیوہ نہیں ہوتا

آپ کے اشعار میں کہیں کہیں الفاظ کی تکرار نہایت پر لطف و پر کیف ہوتی ہے اور شعر دل کی گہرائیوں میں اُترتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں:۔

امیدِ سکوں رخصت تسکین دروں رخصت — اب درد کی باری ہے اب درد مزا دے گا

وہ دِل جس میں تمنا کی خوشی تھی — اُسے صرفِ تمنا دیکھتا ہوں،

دیدار کی طلب کے طریقوں سے بے خبر — دیدار کی طلب ہے تو پہلے نگاہ مانگ

بے خبر کار خبر مشکل نہیں — بے خبر ہو جا۔ خبر ہو جائے گی

غرض آپ کے یہاں مماثل ترکیب۔ الفاظ کی تکرار۔ فقروں کی نشست۔ یہ سب چیزیں اس قدر حُسن و خوبی کے ساتھ نظم ہوتی ہیں کہ شعر میں ایک کیفیت اور ایک اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ آپ کے یہاں، شوخی بھی ہے مگر حدودِ سنجیدگی کے اندر۔ آپ کے یہاں رعنائی بھی ہے، لیکن متانت لئے ہوئے۔ آپ کے یہاں شگفتگی بھی ہے مگر مذاقِ سلیم کے مطابق اور آپ کے یہاں رنگینی بھی ہے مگر بقیدِ سنجیدگی۔ آپ کے صحیح رنگِ تغزل کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:۔

یوں یاد آؤ گے ہمیں اصلا خبر نہ تھی — یوں بھول جاؤ گے ہمیں وہم و گماں نہ تھا

اُٹھو۔ درد کی جستجو کر کے دیکھیں — تلاشِ سکون طبیعت کہاں تک،

نازِ خودداری غلط ثابت ہوا، — عادتِ تسلیم ڈالی جائے گی،

دل اور ترے خیال سے راحت نہ پا سکے — شاید مرے نصیب میں راحت نہیں رہی

جو وہ ملتا نہیں ہے آپ کھو جا — کہ یہ بھی اک طریقِ جستجو ہے

آ۔ مگر اس قدر قریب نہ آ، — کہ تماشا محال ہو جائے

بندہ پرور میں وہ بندہ ہوں کہ بہر بندگی — جس کے آگے سر جھکا دوں گا خدا ہو جائے گا

۳۱۔ افسر میرٹھی

جناب حامد اللہ صاحب افسر میرٹھی دورِ جدید کے ایک خوش گو شاعر ہیں۔ فراق گورکھپوری کی طرح آپ نے بھی انگریزی ادب سے کافی استفادہ کیا ہے جس کا اثر ہمیں آپ کے کلام میں بھی ملتا ہے۔ افسر صاحب کی شاعری رسمِ کہنہ کے مطابق غزلگوئی ہی سے شروع ہوئی لیکن کچھ تو اُن کی آزاد طبیعت کا اثر اور کچھ انگریزی ادب کا پرتو کہ آپ نے اپنے احساسات و تاثرات کی ترجمانی کے لئے غزل گوئی کے میدان کو می زود پایا اور پرانی شاعری کے قید و بند سے آزاد ہو کر نظم کی طرف متوجہ ہو گئے۔ آپ نے نظم گوئی میں بھی اپنے لئے ایک علٰحدہ راہ نکالی اور بچوں کے لئے

سہل و نرم زبان میں چھوٹی چھوٹی نظمیں کہیں جو ملک میں کافی مقبولیت حاصل کر چکی ہیں اور نظمیں اپنی سادگی، شگفتگی، طرزادا اور معصومانہ دلکشی کے لحاظ سے بچوں کے لئے نہایت مفید اور دلچسپ چیزیں ہیں۔ آپ نے نظموں میں مناظرِ فطرت کی بھی عکاسی کی ہے اور اس رنگ کی نظموں کے علاوہ غزلوں میں بھی مناظر کی عکاسی پائی جاتی ہے۔ مثلاً:-

وہ آرہے ہیں ستاروں کو نیند کے جھونکے — اثر کسی پہ تو ہوتا مرے فسانے کا

پھر وحشیوں کو شوق ہوا کوہسار کا — شاید اسی کو کہتے ہیں موسم بہار کا

چمکتی ہے یہ بجلی ابر میں۔ یا — کسی سے کچھ اشارے ہو رہے ہیں

جو غم حد سے زیادہ ہو خوشی نزدیک ہوتی ہے — چمکتے ہیں ستارے رات جب تاریک ہوتی ہے

تاروں کا گو شمار میں آنا محال ہے — لیکن کسی کو نیند نہ آئے تو کیا کرے

تیری بھی اے ابر نیساں ہر صورت دلکش ہوتی ہے — جب جانِ بہار ہے قطرہ ہے۔ جب زیبِ تاج ہے موتی ہے

کون بھلا روتا پھرتا ہے آدھی آدھی راتوں کو — اس بادل کے پردے میں بھی کوئی دل والا ہوگا

آپ حقیقی شاعر ہیں اور اپنے قلبی تاثرات و دلی جذبات کے صحیح ترجمان — آپ کی شاعری روایتی تغزل اور پامال و فرسودہ مضامین حسن و عشق سے پاک ہے۔ تقلید کو آپ نے اپنا سرمایۂ شاعری قرار نہیں دیا ہے۔ آپ کے میلان نظم گوئی اور شاعرانہ جبلت نے جہاں پرانے رنگِ شاعری سے گریز کیا وہاں نئی نئی باتوں کو اپنے یہاں جگہ بھی دی۔ ماحول اور فضا کے مطابق آپ کی غزلوں میں بلبل کے بجائے کوئل و پپیہا۔ اور سرو و گل کے بجائے آموں کے باغ ہیں اور بعض جگہ نغمہ و دشت کے الفاظ کے بجائے راگ اور جنگل کے الفاظ نظر آتے ہیں۔ ہر چند کہ آپ کی غزلیات فارسی کی گو اضافت اور فارسی الفاظ سے خالی نہیں ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ آپ کے کلام میں ہندی الفاظ کا بھی فقدان نہیں ہے اور انھیں آپ آزادانہ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً:-

نظر کے سامنے آ۔ جنگلوں میں بولنے والے — کوئی دھیمی رسیلی ہلکی آوازوں سے کیا سمجھے

رسیلا راگ چھیڑا آم کے باغوں میں کوئل نے — نہ ہو جب کوئی دل والا تو اس کا درد کیا سمجھے

آپ کے صحیح رنگِ تغزل کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:-

یہ جی چاہتا ہے مرا آج افسر — ابھی اور تم سے کئے جاؤں باتیں

رکھ کر نظر کے سامنے تصویرِ خوابِ ناز — پہروں ترے خیال میں بیٹھا رہا ہوں میں

وہ دولت جس کا دنیا نے مسرت نام رکھا ہے — ترے جلووں کی دامانِ نظر میں بھیک ہوتی ہے

مصلحت کا ہے تقاضہ احتیاط — دل یہ کہتا ہے کہ دیکھا کیجئے

للہ! یہ تم دیکھنے والوں سے نہ پوچھو — کیا چیز ہو تم دیکھنے والوں کی نظر میں

اللہ رے جنوں کی یہ ذرہ نوازیاں — بیٹھا ہوا ہوں دل میں بیاباں لئے ہوئے

یہ نظر کی جنبشیں۔ یہ چال اٹھلائی ہوئی — کچھ تمھیں بھی آج اپنی بیخودی کا ہوش ہے

تجھ کو پالینے میں یہ بیتاب کیفیت کہاں — زندگی وہ ہے جو تیری جستجو میں کٹ گئی

نہ صرف مضامین میں بلکہ آپ کے اسلوب بیان میں بھی جدت و ندرت پائی جاتی ہے مثلاً۔ دمِ نزع محبوب کا مزاج پرسی ہونا بہت پامال مضمون ہے۔ مگر جناب افسر اس مضمون کو یوں نظم کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:-

نیچی غمِ رخصت سے وہ معصوم نظر ہو — اور مجھکو کہیں دور کا درپیش سفر ہو

آپ کی شاعری میں ذاتی تجربات کا بھی عکس نظر آتا ہے۔ آپ کا مشاہدہ نہایت وسیع ہے اور آپ نے اپنے تجربات کو نہایت خوش اسلوبی سے اپنے اشعار میں سمویا ہے۔ جیسے:-

ہر خزاں کے غبار میں ہم نے — کاروانِ بہار دیکھا ہے

محوِ تلاشِ راحت تو یہ بھی جانتا ہے — کہتے ہیں جس کو راحت وہ غم کی انتہا ہے

ہم جس کو موت سمجھتے ہیں پیغام حیاتِ جدید ہے وہ — یہ پھول چمن میں جتنے ہیں پھر کھلنے کو مرجھاتے ہیں

سکھ میں ہوتا ہے حافظہ بیکار — دُکھ میں اللہ یاد آتا ہے

حضرتِ افسر کی شاعری کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اُس میں قنوطیت بالکل نہیں پائی جاتی اور اپنے اندر ایک پیغام بھی رکھتی ہے۔ وہ جہاں حیات و کائنات کے تلخ حقایق کی منظر کشی کرتے ہیں وہاں وہ پیغام عمل بھی دیتے ہیں۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں:۔

عمل کی جن میں قوت ہے انھیں ملتی ہیں تاثیریں — نمایاں ہو حیاتِ نو اگر ذروں کے دل چیریں

خدا توفیق دیتا ہے جنھیں وہ یہ سمجھتے ہیں — کہ خود اپنے ہی ہاتھوں سے بنا کرتی ہیں تقدیریں

آپ کی شاعری میں حقیقت اور فلسفہ کے عناصر بھی پائے جاتے ہیں:۔

قریب ہے مری منزل قریب ہے شاید — کہ اب نہیں رہی ہمت قدم اُٹھانے کی

ہائے انجام تجسس کی عجائب کاریاں — تم ملے اور ڈھونڈھنے والے تمھارے کھو گئے

بعض بعض اشعار میں محاکاتی رنگ بھی بہت گہرا ہے۔ مثلاً:۔

دو شخص جب ایسے ملتے ہیں آپس میں جن کو محبت ہو — خاموشی طاری ہوتی ہے لب کھُل کھُل کر رہ جاتے ہیں

کہیں کہیں ایسے اشعار بھی نظر آجاتے ہیں جو اُن کے معیارِ شاعری سے گرے ہوئے ہیں۔ مثلاً:۔

کچھ توجہ خاص ہوتی ہے عیاں — نام لے لے کر نہ کوسا کیجئے

عامیانہ رنگِ تغزل کی غمازی کر رہا ہے۔

مگر اس قسم کے اشعار آپ کے کلام میں بہت کم نظر آتے ہیں۔ علاوہ بریں جناب افسر کی غزلوں میں وہ پختگی۔ حلاوت اور عظمت بھی نہیں پائی جو حضرات ثاقب۔ آرزو۔ یگانہ وغیرہ کے وہاں ہے۔

علی سجاد قہر اکبرآبادی

نگار کے پچھلے پرچے

(۳۶ء) جنوری عدد۔ (۳۷ء) اگست عدد۔ (۳۰ء) مئی عدد۔ (۳۱ء) جولائی ۸ر۔ اگست ۸ر۔ ستمبر عدد۔ اکتوبر ۸ر۔ نومبر ۸ر۔ دسمبر ۸ر۔ (۳۲ء) جنوری للہ ر۔ فروری عدد۔ مارچ عدد۔ مئی، جون، جولائی، ستمبر ۸ر فی پرچہ۔ نومبر عدد۔ (۳۳ء) فروری عدد۔ (۳۴ء) فروری، مارچ، مئی، جون، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر عدد فی پرچہ۔ (۳۶ء) دسمبر عدد۔ (۳۷ء) جنوری عدد۔ فروری عدد۔ مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست ۸ر فی پرچہ۔ اکتوبر عدد۔ (۳۸ء) جنوری عدد۔ فروری ۸ر۔ اپریل عدد۔ مئی تا دسمبر ۸ر فی پرچہ۔ (۳۹ء) جنوری عدد۔ فروری تا جولائی ۸ر فی پرچہ۔ ستمبر عدد۔ اکتوبر، نومبر ۸ر فی پرچہ۔ (۴۰ء) جنوری عدد۔ فروری تا جون ۸ر فی پرچہ، جولائی و اگست عدد فی پرچہ، ستمبر تا دسمبر ۸ر فی پرچہ (۴۱ء) جنوری، فروری عدد۔ مارچ تا دسمبر ۶ر فی پرچہ۔ (۴۲ء) جنوری فروری عدد۔ مارچ، اپریل، مئی، جون ۸ر فی پرچہ۔

مینجر نگار۔ لکھنؤ

مکتوبات نیاز

میں تو آپ کو صرف "خداوند" کہتا تھا۔ "خدا" کب سے ہو گئے؟ لیکن اگر آپ یہ پوچھ بیٹھے کہ ان دونوں میں فرق ہی کیا ہے۔ تو سوا چُپ رہنے کے اور کیا کر سکتا ہوں!

بندہ نواز، خدا جانے کتنے ناتمام شکوے ایسے ہیں جو ایک زمانہ سے سینے میں چُبھ رہے ہیں، لیکن میں نے کبھی آپ پر ظاہر نہیں ہونے دیئے — اب آپ چاہتے ہیں کہ یہ سب کچھ "واشگاف" ہو جائے شاید اسلئے کہ آپ کے نزدیک ہم بندگان ضعیف میں صدائے "لنترانی" سننے کی تاب نہیں ہے یا پھر اس لئے کہ

تا کجا خواہم فشرد ایں دامن نمناک را

بہرحال آپ خدا ٹھہرے اور خدا کی نیت کا حال خدا ہی کو معلوم ہو سکتا ہے، اس لئے میں زیادہ قیاس آرائی سے کام لیتے ہوئے ڈرتا ہوں، مگر اتنا ضرور عرض کرونگا کہ یہ دور "عدمیت" کا ہے۔ یعنی بادشاہ اور بادشاہ کے قسم کی جتنی چیزیں ہیں سب دُنیا سے محو ہوتی جا رہی ہیں، اس لئے اگر حرج نہ ہو تو "کارگاہ کبریائی" کو زیادہ وسیع نہ ہونے دیجئے اور ہو سکے تو اسے مختصر کر کے انسانی دسترس سے قریب کر دیجئے، ورنہ دنیا میں جُنید و شبلی کے پاس بھی اس کا جواب نہیں کہ

رہ گم شدگانیم، چہ جوئیم خدا را

پھر میں یہ تو نہیں کہتا کہ جن کو آپ نے خفا کر دیا ہے، انھیں خود ہی بلائیے، لیکن اگر وہ آنا چاہتے ہیں تو کم از کم انھیں ٹھکرائیے بھی نہیں۔ "یوسف بے کارواں" بھی کوئی "یوسف" ہیں "یوسف" ہے!

مکرمی تسلیم۔ شعر و شاعری میں آپ کی ژرف نگاہی کا قایل ہوں، لیکن بعض اوقات آپ اس قدر میکانکی (Mechanical) قسم کی باتیں کرنے لگتے ہیں کہ ان کا جواب ممکن ہو یا نہ ہو، لیکن شعر کا لطف یقیناً خاک میں مل جاتا ہے

جس زاویۂ نگاہ سے آپ نقد فرماتے ہیں، وہ اتنا تنگ ہے کہ مشکل ہی سے شعر کی وسعتیں اس سے ناپی

جاسکتی ہیں، لیکن چونکہ اس میں منطق ہوتی ہے، اس لئے کوئی معقول جواب بھی نہیں دیا جاسکتا

پھول، خوشبو، رنگ، موسیقی اور شاعری سب ایک ہی قبیل کی چیزیں ہیں جن سے ریاضی والی ذہنیت بہت کم لطف اُٹھا سکتی ہے۔ مگر پھول کے رنگ و بو سے لطف اُٹھانے والے پنکھڑیوں کی ناہمواری کو نہیں دیکھتے، اور موسیقی پر وجد کرنے والے ساز کے حسن و قبح سے بے نیاز ہوتے ہیں۔

آپ کی کیمیاوی اور میکانکی ناپ تول اپنی جگہ بالکل درست، لیکن شعر سے اس کو کیا تعلق۔ اس کا مقیاس تو صرف وجدان ہے۔ غالب کا ایک شعر ہے:۔

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اُڑ جائے
جلاد سے لیکن وہ کہے جائے کہ ہاں اور!

کتنا پاکیزہ شعر ہے، ذوق اس کو سُنکر کس قدر آسودہ ہوتا ہے، لیکن آپ کے منطقیانہ نقطۂ نظر سے یہ بالکل مہمل قرار پائے گا۔ جلاد کا کام یہ ہے کہ وہ تلوار لیکر ایک بار سر اُڑا دے، اس میں "ہاں اور" کی گنجایش کہاں؟ جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ ضروری نہیں ایک ہی ضرب میں سر اُڑ جائے۔ ہوسکتا ہے کہ جلاد کی پہلی ضرب میں، غالب کی گردن کا صرف ایک حصہ کٹا ہو اور جب جلاد نے ہاتھ روک لیا ہو تو محبوب نے "ہاں اور" کہا ہو۔ لیکن یہ جواب اعتراض سے زیادہ لغو ہوگا

ایک اور شعر سنئے:۔

قفس میں ہوں گر اچھا بھی نہ جانے میرے شیون کو
مرا ہونا بُرا کیا ہے نواسنجانِ گلشن کو

اہلِ ذوق کے نزدیک یہ شعر غالب کے بہترین اشعار میں سے ہے۔ لیکن منطق سے کام لیجئے تو یہ بھی مہمل نظر آئے گا۔ "مرا ہونا"۔ کہاں ہونا؟ قفس میں۔ بالکل ٹھیک۔ لیکن سوال یہ ہے کہ "نواسنجانِ گلشن" کو غالب کا وجود چمن میں کیوں ناگوار ہے، کیا اس لئے کہ وہ قفس میں ہے، نہیں، بلکہ صرف اس بناء پر کہ وہ شیون کرتا رہتا ہے۔ پھر ایسی صورت میں کہ "نواسنجانِ گلشن" غالب کے شیون ہی کو پسند نہیں کرتے، خواہ وہ قفس میں ہو یا قفس سے باہر، یہ کہنا کہ "مرا ہونا بُرا کیا ہے" کوئی معنی نہیں رکھتا اور غالب کی طرف سے گلشن میں رہنے کے لئے یہ استدلال بالکل مہمل ہے

ایک اور شعر:۔

ہو کے عاشق وہ پری رُخ اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے، جتنا کہ اُڑتا جائے ہے

اول تو رنگ اُڑنے کے بعد اس کا اور زیادہ کھُل جانا ضروری نہیں، لیکن اگر ایسا ہو بھی تو نزاکت سے اسے کیا واسطہ۔ نزاکت کا تعلق رنگ سے نہیں بلکہ جسم کی ساخت سے ہے۔ لیکن غالب نزاکت کے ثبوت میں صرف رنگ اُڑ جانا پیش کرتے ہیں۔ علاوہ اس کے "پری رُخ" کا فقرہ بھی قابلِ غور ہے۔ کسی کو "پری رُخ" کہنے کے معنے ہی یہ ہیں کہ رنگ و نقشہ کے لحاظ سے وہ معیاری حُسن رکھتا ہے اس لئے رنگ اُڑنے کے بعد اس میں رنگ کھُلنے کی گنجایش کہاں؟ بہرحال اس قسم کی گفتگو سے ہر اچھے سے اچھے شعر کو مکروہ دکھا سکتے ہیں

آپ میں بھی کبھی کبھی یہی ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے، جس سے آپ کے (Humour) پر توصیقل ہو سکتی ہے، لیکن لطفِ شعر سے آپ محروم ہو جاتے ہیں۔ اسے چھوڑئے اور جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، پھول کی پنکھڑیاں نہ دیکھئے، بلکہ صرف اس کی خوشبو سے لطف اُٹھائیے۔ علاوہ اس کے یوں بھی شاعروں کو دُنیا میں جینے کا حق حاصل ہے، اگر آپ نے اتنا پریشان کیا تو وہ غریب کیا کریں گے!

صدیقی - آپ کو جولائی کے نگار سے یہ تو معلوم ہو گیا ہوگا کہ میں اس زمانہ میں بہت علیل رہا، لیکن یہ نہ معلوم ہوا ہوگا کہ "دورانِ مایوسی" میں آپ کتنی بار یاد آئے

جس وقت "ضغطۂ قلب" کا دورہ پڑتا تھا اور نوبت نفس شماری کی آجاتی تھی، تو صرف ایک خیال میرے سامنے ہوتا تھا۔ وہ یہ کہ میرے بعد نگار کا کیا حشر ہوگا اور ساتھ ہی بے اختیارانہ آپ یاد آجاتے تھے۔ کیوں؟ — اس کو آپ مجھ سے بہتر سمجھ سکتے ہیں اگر بغیر کسی شاعرانہ انکسار کے اپنی اہلیت کو سامنے رکھیں

اب میں اچھا ہوں، لیکن نہیں کہہ سکتا، کب، کیا انقلاب پیدا ہو، اس لئے یہ عریضہ استمزاج یا استصواب کی غرض سے نہیں لکھ رہا بلکہ آپ سے یہ مستحکم وعدہ حاصل کرنے کے لئے کہ میرے بعد نگار کے لئے اپنے وقت کی تھوڑی سی قربانی ضرور گوارا کریں گے، جس کا معاوضہ آپ میری بیوی سے طے کر لیں گے

یہ میں ابھی سے اس لئے لکھے دیتا ہوں کہ معلوم نہیں بروقت اس کی مہلت بھی ملے یا نہ ملے! مجھے یقین ہے کہ آپ کو میرے بعد بہت دن جینا ہے اور یہ بھی سمجھتا ہوں کہ آپ مجھ سے بہتر میری جگہ پُر کریں گے بغیر اس زحمت کے کہ آپ ترکِ وطن کر کے یہاں تشریف لائیں۔ موعودہ مقالہ کا انتظار ہے

تمہاری بزم میں شرکت کی تمنا کس کو نہ ہوگی، لیکن مشکل یہ ہے کہ

جو کوئی آئے ہے نزدیک ہی بیٹھے ہے ترے
ہم کہاں تک ترے پہلو سے سرکتے جائیں!

تمہارا جلوہ ارزاں اور یہاں جرأت رندانہ مفقود! تمہیں بتاؤ زندگی کی کیا صورت ہے ؟

میں جانتا ہوں تبدیل مقام کی مجھے ضرورت ہے، لیکن تمہارے یہاں ! جہاں "مقام" کا وجود ہی معدوم ہے! تم نے جس محبت سے بلایا ہے اس کی تعمیل بیشک مجھ پر فرض ہے لیکن تمہارے مہمانوں کا ہجوم مجھے اس فرض سے کب عہدہ برآ ہونے دیتا ہے ۔ اگر کبھی اتفاق سے تنہائی کا کچھ زمانہ تمہیں مل جائے تو لکھنا۔ لیکن جانتا ہوں یہ کبھی نہ ہوگا اور مجھے بغیر تبدیل مقام ہی کے اچھا ہونا پڑے گا ۔ خیر، ۔ خوش رہو

حضرت ۔ آپ مجھ پر ظلم کرتے ہیں صرف اس لئے کہ میں آپ کا بندہ ہوں ۔ اس سے زیادہ مسرت اور کیا ہو سکتی ہے!

بر پائے و دست بند گرانے نہادۂ
نازم بہ بندگی کہ نشانے نہادۂ

لیکن سوال یہ ہے کہ اس عذر کی ضرورت ہی کیا تھی ۔ کیا خدانخواستہ آپ کو میری طرف سے شکوہ و شکایت کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا یا یہ بھی کوئی تازہ "طرحِ ستم" تھی ؟

مجھے یقین ہے کہ آپ نے جو کچھ کیا وہ صرف اعتماد کی بنا پر اور میں کبھی آپ کو اپنے اعتماد سے شرمندہ نہ ہونے دونگا مطمئن رہئے ۔ میں بیشک اس قابل نہیں رہا کہ وہاں جا کر منہ دکھاؤں، لیکن آپ سرخرو ہو گئے یہی کیا کم ہے ؟

جی ہاں، مینے جگر کی فارسی غزل مدینہ میں دیکھی ۔ اوّل تو "مدیر مدینہ" نے اس کا عنوان "جگر پارے" غلط رکھا۔ اُردو کی غزل ہوتی تو مضایقہ نہ تھا ۔ فارسی غزل کے لئے "جگر پارہ" یا "پارہائے جگر" مناسب تھا

نفسِ غزل کے متعلق سوا اس کے کیا عرض کروں کہ وہ فارسی تو ہے نہیں، البتہ اسے مشکل اُردو کہہ سکتے ہیں ۔ مطلع کا پہلا ہی مصرعہ ملاحظہ ہو :-

بہ سرت کہ ساقی مستِ من بہ سرور بے طلبی خوشم

درمیان کا ٹکڑا "ساقی مستِ من" صرف وزنِ شعر کو پورا کرتا ہے ۔ "کہ" غلط جگہ استعمال ہوا ہے اور "مست" کا لفظ بالکل بیکار ہے ۔ اسی طرح دوسرے اور تیسرے شعر کا پہلا مصرعہ بالکل انشاء مادھو رام کی فارسی ہے ۔ چوتھے شعر میں "حسن" کے بعد تمام کا لفظ بیکار ہے اور دوسرا مصرعہ بالکل مہمل !

مقطع غنیمت ہے ۔ لیکن وہاں بھی "بہ نگاہ عشوہ طراز" کے جگہ "زنگاہ عشوہ طراز" ہونا چاہئے ۔

ان کے اُستاد "اصغر" کو بھی کبھی کبھی یہ خبط ہو جاتا تھا کہ وہ فارسی میں شعر کہہ سکتے ہیں، اگر جگر بھی اپنے اُستاد کی سنت پر چلکر کسی وقت ایسی غلطی کر بیٹھیں تو قابل عفو ہیں ؟

باب الاستفسار

رسالۂ "عصمت" - جناب سیمابؔ اکبرآبادی
اور
نظم "طاعتِ شوہر"

(جناب علی گوہر صاحب - لاہور)

جولائی کے رسالۂ عصمت میں، حضرت سیمابؔ اکبرآبادی کی ایک نظم "طاعتِ شوہر" کے عنوان سے شایع ہوئی ہے۔ اس میں انھوں نے عہد رسالت کا ایک واقعہ نظم کیا ہے، اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔

(نگار) آپ کا استفسار موصول ہونے کے بعد میں نے اس نظم کو دیکھا۔ اس میں جو واقعہ درج ہے اس کی تفصیل یہ ہے:-

"عہد نبوی میں ایک سوداگر مسجد نبوی کے پاس رہا کرتا تھا۔ ایک دن وہ باہر سفر پر جانے لگا تو اس نے اپنی بیوی کو ہدایت کی کہ میرے پیچھے تم گھر سے باہر نہ جانا۔ تین دن کے بعد عورت کے میکے سے خبر آئی کہ اس کا بوڑھا باپ زخمی ہوگیا ہے اور اپنی بیٹی کی صورت دیکھنا چاہتا ہے۔ چونکہ سوداگر اپنی بیوی کو جانے سے منع کر گیا تھا اس لئے اس نے رسول اللہ کے پاس خادمہ کو بھیجکر زخمی باپ کے پاس جانے کی اجازت چاہی، لیکن آپ نے فرمایا "نہیں، ہرگز نہیں"

چند دن بعد میکے سے پھر آدمی آیا کہ اس کا باپ نزع کی حالت میں ہے اور اپنی بیٹی کے دیکھنے کے لئے تڑپ رہا ہے، اس نے پھر رسول اللہ سے التجا کی کہ:-

اب خدارا اُس سے ملنے کی اجازت دیجئے
رحمۃ اللعالمیں ہیں آپ، رحمت کیجئے

لیکن "رحمۃ للعالمین" نے پھر بھی اجازت نہ دی۔

اس کے بعد باپ کے مرنے کی خبر آئی اور یہ اس وقت بھی نہ جا سکی۔ جب شوہر واپس آیا تو اسے یہ سارا حال معلوم ہوا اور اپنی بیوی کی وفاداری کا حال سُنکر دل میں بہت خوش ہوا۔ کچھ دن بعد اس عورت نے اپنے باپ کو خواب میں دیکھا کہ وہ فردوس میں خوش خوش پھر رہا ہے۔

اس نے - "پوچھا، ابا جان یہ رتبہ ہوا کیونکر نصیب"
تو جواب ملا کہ تو نے جو طاعتِ شوہر کی تھی ـــــ اس کے بدلہ میں مجھے اللہ سے جنّت ملی ـــــ"

نظم تو خیر جیسی ہے ہے، لیکن جس روایت کو نظم کیا گیا ہے وہ یقیناً بہت عجیب و غریب ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ قصہ حاتم طائی، ہرنی نامہ اور نور نامہ کا عہد ختم ہوگیا لیکن تعجب ہے کہ ابھی تک یہ ذہنیت موجود ہے اور سیمابؔ صاحب ایسے حضرات کی دنیا میں بھی موجود ہے ! !

یقیناً یہ روایت معمولی "میلاد" کی کتابوں سے لی گئی ہے، لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو بھی درایتاً رد کر دینے کے قابل ہے، خواہ وہ صحاح ستہ ہی میں کیوں نہ درج ہو، یہ روایت ان لوگوں کی اختراع ہے جنھوں نے عورت کو ذلیل سمجھ کر اس پر حکومت بلکہ جبر و تعدی کرنے کو جایز قرار دیا اور عہد سعادت میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی۔

اسلام نے عرب سوسائٹی میں سب سے بڑے دو انقلاب پیدا کئے، ایک غلاموں کے ساتھ بہتر سلوک کرنا، دوسرے، عورت کی پوزیشن کو بلند کرنا، لیکن عربوں کی ذہنیت ان دونوں باتوں کو آسانی سے قبول نہ کر سکتی تھی کیونکہ وہ غلام و عورت دونوں کو مملوکہ شے کی حیثیت سے دیکھنے اور ان کو ہر طرح سے تصرف میں لانے کے عادی تھے۔ جب تک رسول اللہ زندہ رہے اس وقت تک تو خیر کسی کو مخالفت کا یارا نہ تھا لیکن آپ کی رحلت کے بعد جب عہد بنی امیہ و بنی عباس میں بعض بندشوں کو توڑنے اور بعض نئی باتوں کو اختیار کرنے کے لئے وضع احادیث کی ٹکسالیں قائم ہوئیں، تو اسی وقت اس قسم کی بھی بہت سی حدیثیں وضع کی گئیں جنکا تعلق عورت اور اس کے تمدنی موقف سے تھا اور یہ روایت بھی (اگر واقعی یہ کوئی روایت ہے) انھیں میں سے ایک ہے۔

اس میں شک نہیں، جس نے یہ روایت گھڑی ہے وہ بہت ذہین شخص تھا، کیونکہ عورت کو مرد کا محکوم و غلام ثابت کرنے کے لئے وہ اس سے زیادہ سخت روایت کوئی، پیش نہ کر سکتا تھا، لیکن اسے یہ خبر نہ تھی کہ اس کا یہ مبالغہ ہی اس کے کذب کا ثبوت بن جائے گا۔

اس میں شک نہیں رسول اللہ نے بیویوں کو شوہروں کی اطاعت کی تعلیم دی تھی، لیکن صرف اسی حد تک کہ اخلاق و انسانیت مجروح نہ ہوں۔ لیکن یہ روایت اس روح کے بالکل منافی ہے۔

رسول اللہ بالطبع بے انتہا رحمدل تھے اور آپ کبھی کسی کی تکلیف نہ دیکھ سکتے تھے، لیکن اس روایت میں رسول اللہ کو نہایت سنگدل انسان کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ آئین و قانون کے باب میں آپ سخت گیر بھی تھے، تو اس کے معنے یہ ہیں کہ آپ نے اطاعتِ شوہر کے مسئلہ کو نہایت دلشکن حد تک سخت بنا دیا تھا حالانکہ یہ "الدین یسر" کی تعلیم کے بالکل منافی تھا۔

سوال یہ ہے کہ اگر سودا گر موجود ہوتا اور وہ ایسی حالت میں اپنی بیوی کو گھر جانے کی اجازت نہ دیتا، تو کیا رسول اللہ اس کے اس عمل کو پسند فرماتے۔ غالباً نہیں پھر ایسی حالت میں جبکہ سودا گر موجود نہ تھا اور اس کی بیوی نے رسول اللہ سے اجازت طلب کی، آپ نے کیوں وہی طرز عمل اختیار کیا جو سودا گر کی طرف سے آپ کے نزدیک ناپسندیدہ ہوتا۔

رسول اللہ تمام قوم کے سردار تھے اور آپ کو اختیار حاصل تھا کہ موقعہ و محل کے لحاظ سے جو حکم مناسب سمجھیں صادر فرمائیں، اس لئے اگر آپ عورت کو گھر جانے کی اجازت دیدیتے، تو کیا یہ اجازت تعلیم اسلام یا آپ کی پوزیشن کے منافی ہوتی؟ اور کیا آپ یہ نہ سمجھتے تھے کہ وہ اجازت نہ دیکر عورت پر ناجائز سختی کرنے کی ایک بُری مثال قائم کر رہے ہیں۔

اس روایت کا آخری ٹکڑا سب سے بڑا ثبوت اس کے غلط ہونے کا ہے اور وہ یہ کہ خدا نے عورت کے باپ کو صرف اس لئے فردوس مرحمت فرمائی کہ اسکی بیٹی نے اپنے شوہر کی اطاعت کی تھی۔ اول تو یہ عقیدہ نص قطعی کے خلاف ہے کہ ایک کے اچھے یا بُرے کام کا اثر دوسرے پر پڑے۔ علاوہ اس کے اصول درایت میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جس حدیث میں چھوٹی سی بات پر بڑا اجر یا عذاب بیان کیا جائے وہ روایت موضوع ہے۔

مجھے سب سے زیادہ حیرت عصمت کے اڈیٹر پر ہے کہ انھوں نے کیوں اس نظم کو شایع کیا۔ مولانا راشد الخیری مرحوم کی زندگی اس کوشش میں ختم ہوگئی کہ عورت پر جو سختیاں مردوں کی طرف سے ہو رہی ہیں ان کو دور کیا جائے اور آج اُن کے پسماندان یہ روایت شایع کر رہے ہیں جو عورت کو ذلیل ترین غلامی کی حدود میں کھینچ لانے والی ہے۔

لشتان ما بین الیزیدین فی الندی
یزید سلیم و آخر ابن حاتم !

کیا یزیدی جماعت شیطان پرست ہے

(جناب محمد ادریس صاحب۔ کلکتہ)

ماڈرن ریویو کے "اورینٹ" میں ایک مضمون یزیدی جماعت کے متعلق شایع ہوا ہے، جس میں تحریر ہے کہ یہ لوگ شیطان پرست ہیں۔ کیا یہ

درست ہے ؟ اس جماعت کو یزیدی کیوں کہتے ہیں اور اسکی تاریخ کیا ہے ؟

(نگار) چونکہ لڑائی قفقاز تک پہونچگئی ہے، اس لئے اخبارات اب قاف وجمار قاف کی قوموں کی طرف بھی متوجہ ہوئے ہیں، لیکن عام طور پر جو حالات شائع ہوتے رہتے ہیں وہ کسی تحقیق کا نتیجہ نہیں ہوتے، بلکہ سطحی و سرسری ہوا کرتے ہیں، چنانچہ اورینٹ کا یہ لکھنا کہ یزیدی "شیطان پرست" ہیں، بالکل ایسا ہی ہے جیسے مولویوں کا سوائے اپنے ساری دُنیا کو کافر کہنا!

یزیدی قوم، کُردستان کی قوم ہے جو موصل، دیار بکر، حلب اور طفلس تک پھیلی ہوئی ہے۔ موصل کے شمال میں ۴۰ میل کے فاصلہ پر ایک مقام بعذری ہے جہاں انکا امیر رہتا ہے اور "وادی شیخ عدی" میں جو لالش کے جنوب میں تین گھنٹہ کی مسافت پر واقع ہے، شیخ عدی کا مقبرہ ہے، جسے اس جماعت کا مکہ کہنا چاہئے انکی آبادی کسی وقت ایک لاکھ سے اوپر تھی، لیکن اب ساٹھ ستر ہزار سے زیادہ نہیں ہے۔

اس جماعت کا تعلق نہ یزید بن معاویہ سے ہے، نہ یزید بن انیسہ سے اور نہ ایران کے شہر یزد سے۔ بلکہ اس کی اصل ایزدی ہے یعنی "خدا پرست"!۔۔۔ یہ لوگ خود اپنے آپ کو دارسن، دسنی اور دسینی کہتے ہیں، کیونکہ ان کے ایک مورث اعلیٰ کا نام "حسین بیگ داسنی" تھا جسے ۹۴۷ھ میں سلطان سلیمان نے جاگیر بھی عطا کی تھی۔

صورت شکل میں یہ جماعت کُرد جماعت سے بہت مشابہ ہے گو دونوں کے عادات وخصایل ایک سے نہیں ہیں یہ لوگ بڑے محنتی، جفاکش اور عہد وپیمان کے پابند ہیں۔ کاشتکاری اور مویشی پالنا ان کا پیشہ ہے، اور معاشرت کے لحاظ سے بہت صاف ستھرا رہتے ہیں۔ یہ جماعت مختلف قبایل میں منقسم ہے اور ہر قبیلہ کا ایک سردار ہوتا ہے۔ ان میں سے بعض قبایل خانہ بدوش زندگی کے بھی عادی ہیں اور مویشیوں کو اِدھر اُدھر لئے پھرتے ہیں۔

ان کی زبان قریب قریب وہی ہے جو کُرد قوم کی لیکن بعض قبایل میں عربی بھی بولی جاتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ پہلے سب کی زبان عربی رہی ہو اور بعد کو کُردستان کی طرف منتقل ہونے سے وہ کُردی زبان بولنے لگے ہوں۔

ان کا مذہب مختلف مذاہب کا مجموعہ ہے، کیونکہ ان کے عقاید ومراسم میں، زردشتی، مانوی، یہودی، عیسوی اور مسلم عناصر بہت کچھ ملے جلے نظر آتے ہیں۔ ان کی مذہبی کتابیں جنھیں وہ الہامی کہتے ہیں دو ہیں:۔ کتاب الجلوہ اور مصحف رش (یعنی سیاہ کتاب ۔ شیعوں کی طرح سیاہ رنگ ان کے یہاں بھی عزت واحترام کا رنگ سمجھا جاتا ہے) اور دونوں عربی میں ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے مذہب کا منشاء دولہ عرب ہی کی سرزمین ہے۔

زردشتی مذہب کی طرح ان کے یہاں بھی "ثنویت" پائی جاتی ہے۔ زردشت کے یہاں یزداں واہرمن کا وجود ہے، ان کے یہاں خدا اور ملک طاؤس کا۔ ان کا عقیدہ ہے کہ خدا صرف دنیا کا خالق ہے، لیکن اس کا انتظام ملک طاؤس سے متعلق ہے اور اسی فرشتہ نے شیخ عدی میں جنم لیا تھا۔

ان کا عقیدہ ہے کہ ملک طاؤس سے جو غلطی ہوئی تھی (یہ غلطی غالباً یہ تھی کہ اس نے سانپ کو جو دراصل شیطان تھا فردوس میں پہونچا دیا تھا) اسکی سزا میں وہ مردود بنا دیا گیا لیکن بعد کو وہ بہت پچھتایا اور رو یا یہاں تک کہ اس کے آنسوؤں سے جہنم سرد ہوگیا۔ اسی لئے یہ لوگ جہنم کے وجود کے قائل نہیں ہیں اور نہ مرنے کے بعد عذاب کے!

بعض کا خیال ہے کہ طاؤس کا ماخذ تموز، تاموز یا تاؤز ہے جو بابل اور اسیریا والوں کا خدا تھا، لیکن یہ صحیح نہیں، کیونکہ جو روایت ملک طاؤس کے متعلق انکے یہاں پائی جاتی ہے وہ اس کی موید نہیں۔

طاؤس کے مجسمے یا بُت لوہے پیتل کے طیار کئے جاتے ہیں جنھیں سنجق کہتے ہیں۔ ان کے یہاں سات سنجق پائے جاتے ہیں (جو سات فرشتوں کے وجود کو ظاہر کرتے ہیں) اور ان کا نام بھی انھوں نے اُن سات مختلف انسانوں کے نام پر رکھا ہے جنھوں نے ذریعۂ تناسخ درجۂ الوہیت حاصل کرلیا تھا۔ ان میں سے چھ کے نام یہ ہیں:۔

داؤد ۔ شیخ شمس الدین ۔ یزید بن معاویہ ۔ شیخ عدی، حسن البصری، منصور حلاج ۔۔۔ آخری سنجق (منصور حلاج) کا ۶۷۹ پونڈ وزن کا ہے جو شیخ عدی کے مقبرہ میں رکھا رہتا ہے۔ ساتویں سنجق کا پتہ نہیں چلتا اور نہ ان کے لٹریچر میں اس کا ذکر پایا جاتا ہے۔

یہ جماعت سب سے الگ تھلگ رہتی ہے، کیونکہ انکا عقیدہ ہے کہ وہ آدم کے اس نطفہ سے پیدا ہوئے ہیں جو ایک ظرف میں بند کرکے علٰحدہ رکھدیا گیا تھا۔ چونکہ ان کا معاشرتی تعلق اور کسی قوم سے نہیں ہے، اس لئے انکے یہاں سب سے سخت سزا یہ ہے کہ ایک شخص کو جماعت سے علٰحدہ کردیا جائے، اور اس کا اثر ان کے اخلاق پر بہت اچھا پڑا ہے۔

ان کی عبادت کا وقت صبح وشام ہے جو سورج کی طرف رُخ کرکے ادا کی جاتی ہے، لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ وہ آفتاب پرست ہیں۔ سورج کی طرف ان کا رُخ کرنا محض اس لئے ہے کہ ملک طاؤس روشنی کا فرشتہ ہے اور سورج میں بھی ملک طاؤس ہی کا جلوہ پایا جاتا ہے۔ عبادت کے وقت یہ پتھر رکھ کر اس کے چاروں طرف

طواف بھی کرتے رہتے ہیں ۔ دسمبر میں تین دن روزہ بھی رکھتے ہیں اور بدھ کا دن ان کے یہاں بہت مبارک مانا جاتا ہے ۔ ان کا سالانہ حج ۱۵ سے ۲۰ دسمبر تک شیخ عدی کے مقبرہ پر ہوتا ہے ۔ بڑا ہجوم ہوتا ہے اور گانا بجانا، حال قال سبھی کچھ ہوتا ہے ۔ یہ لوگ اسوقت دریا میں نہاتے ہیں اور سنجق کو بھی پانی میں غوطہ دیتے ہیں ۔ سنجق کا جلوس نکالا جاتا ہے، قربانیاں ہوتی ہیں اور چراغاں کیا جاتا ہے ۔

شیخ عدی کے مقبرہ کی مٹی سے چھوٹے چھوٹے گیند بنائے جاتے ہیں اور انھیں تبرکاً لوگ لیجاتے ہیں مریضوں کو کھلاتے ہیں اور آسیب دور کرتے ہیں ۔ یہ گویا ان کی خاکِ شفا ہے ۔ خانقاہ شیخ عدی کے اندر جو مراسم ادا کئے جاتے ہیں انھیں کوئی غیر شخص نہیں دیکھ سکتا ۔ خانقاہ کے درخت بھی متبرک سمجھے جاتے ہیں، ان کے چاروں طرف دیواریں اٹھادی گئی ہیں اور لوگ یہاں آکر منتیں مانتے ہیں ۔ ان کا مشہور قومی تہوار جسے یہ سرسال (یعنی نوروز) کہتے ہیں اپریل کے پہلے چہار شنبہ کو ہوتا ہے ۔ بڑے اہتمام سے شیخ عدی کے مقبرہ پر منایا جاتا ہے، لیکن اس میں گانا بجانا نہیں ہوتا ۔ سُرخ رنگ کے پھولوں سے آراستگی البتہ بہت کی جاتی ہے ۔

ان کے یہاں کسی نہ کسی دینی بھائی یا بہن کا ہونا ضروری ہے جس کے ہاتھ کو روز بوسہ دیا جاتا ہے ۔ شادی قبیلہ سے باہر نہیں ہوتی اور صرف ایک ہوتی ہے ۔ لیکن امراء ایک سے زیادہ بیویاں رکھ سکتے ہیں ۔ شادی کے وقت مقامی پیر روٹی کے دو ٹکڑے کرکے ایک ایک میاں بیوی کو دیدیتا ہے ۔ دُلہن سُرخ لباس میں ہوتی ہے اور شادی کے بعد تمام معبدوں میں جاتی ہے جن میں مسجدیں اور گرجا بھی شامل ہوتے ہیں ۔ جب بیوی شوہر کے گھر میں داخل ہوتی ہے تو شوہر پتھر کا ایک ٹکڑا لیکر اسے مارتا ہے جس سے گویا یہ فال لیجاتی ہے کہ وہ ہمیشہ مرد کی مطیع رہیگی ۔ زنا کی سزا ان کے یہاں موت ہے اور طلاق کا رواج بھی کم ہے ۔ بیوہ عورت چھ مرتبہ شادی کرسکتی ہے اور اگر کوئی یزیدی ایک سال سے زیادہ غائب رہے تو پھر وہ نہ اپنی بیوی کے پاس جاسکتا ہے، نہ دوسری شادی کرسکتا ہے ۔ ان کے یہاں عیسائیوں کی طرح بپتسمہ کا بھی رواج ہے ۔ جب کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو خانقاہ کے حوض میں اسے غوطہ دیتے ہیں یا حوض کا پانی اسپر چھڑکتے ہیں ۔ بپتسمہ کے بعد ختنہ کا بھی رواج ہے لیکن ضروری نہیں

مُردہ کو مشرق کی طرف سر کرکے دفن کرتے ہیں اور جب کوئی بڑا آدمی مرجاتا ہے تو لکڑی پر اس کے کپڑوں کو لٹکا کر تین دن تک جلوس نکالتے ہیں جس کے ساتھ گانا بجانا بھی ہوتا ہے، مرنے کے بعد تیسرا، ساتواں اور چالیسواں دن عزاداری کا دن ہے اور خاص خاص رسمیں اسوقت ادا کی جاتی ہیں ۔

یزیدیوں کی دو جماعتیں ہیں ۔ ایک اونچی جماعت جسے مُرید کہتے ہیں ۔ اس جماعت میں دولت کے لحاظ سے بڑے چھوٹے کا کوئی نہیں، سب برابر سمجھے جاتے ہیں ۔ دوسری جماعت روحانی کہلاتی ہے ۔ یہ کاہنوں یا پیروں کی جماعت ہے ۔ ان کی بڑی عزت کی جاتی ہے ۔ یہ سکھوں کی طرح اپنے بال نہیں کٹا سکتے ۔

یہ جماعت بھی چھ طبقوں میں منقسم ہے ۔ سب سے اونچا طبقہ شیخ کہلاتا ہے جو براہ راست شیخ عدی کی نسل کے پانچ خانوادوں سے تعلق رکھتا ہے ۔ ان کا لباس سفید، عمامہ سیاہ ہوتا ہے اور اوپر سے سُرخ یا زرد رنگ کی چادر اوڑھتے ہیں ۔ ان کے گھر گویا معبد کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ اس کے بعد دوسرا طبقہ پیر کہلاتا ہے، ان کا لباس سیاہ، عمامہ سفید ہوتا ہے جس پر ایک سیاہ پرا لگا ہوتا ہے ۔ شادی بیاہ اور موت زیست کی تمام رسمیں انھیں سے متعلق ہوتی ہیں ۔

تیسرا طبقہ فقیروں یا قرہ باشوں کا ہے (قرہ باش ترکی زبان میں سیاہ سر کو کہتے ہیں) ان کا لباس و عمامہ دونوں سیاہ ہوتے ہیں ان کی بسر اوقات کا ذریعہ صدقہ و زکوٰۃ ہے ۔ یہ گویا ایک قسم کے گداگر ہیں اور خانگی نزاعات طے کرانے اور شادیاں ٹھہرانے کا بھی کام کرتے ہیں ۔

چوتھا طبقہ قوالوں کا ہے ۔ جو مذہبی تہواروں میں گانے بجانے کا کام کرتے ہیں، پانچواں طبقہ کوچاق کہلاتا ہے، یہ خانقاہوں میں رقص کرتے ہیں، چھٹا طبقہ کوادحان کہتے ہیں یہ گویا مجاوروں کا طبقہ ہے جو شیخ عدی یا دوسرے مقدس مزاروں پر دربانی اور جاروب کشی کی خدمت انجام دیتے ہیں ۔

یزیدیوں کی ہیئت اجتماعی کا نظام دو آدمیوں کے ہاتھ میں ہے، مذہبی یا روحانی نظام میر شیخان کے ہاتھ میں ہے جو لالش میں رہتا ہے ۔ مذہبی مسائل میں اسکی رائے بالکل آخری رائے سمجھی جاتی ہے اور شیخ عدی کے مقبرہ کے بعد اسی کا مکان سب سے زیادہ قابلِ احترام سمجھا جاتا ہے ۔

دنیاوی معاملات امیر الامراء کے سپرد ہیں ۔ یہ بغدری میں رہتا ہے اور یزیدیوں کا بہت بڑا سیاسی لیڈر سمجھا جاتا ہے ۔

تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ بنو امیہ کے زمانہ میں یزیدی تحریک شام میں شروع ہوئی ۔ یہ لوگ تیمور کے زمانہ میں بصرہ سے آئے اور سنجر و کردستان تک پھیل گئے بعض مسلم مورخین نے ان کو یزید بن معاویہ اور بعض نے یزید بن انیسہ سے منسوب کیا ہے، لیکن خود یزیدی جماعت اس کی منکر ہے بعض بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ یزید ترک اسلام کرکے اس جماعت میں شامل ہوگیا تھا جو اس کے نام سے موسوم تھی، لیکن یزیدی کہتے ہیں کہ یزید ان کے مذہب کا بانی نہ تھا بلکہ اس کا احیار کرنے والا تھا بہرحال اس مذہب کی اصل بنیاد کے متعلق یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاتا، لیکن یہ بالکل یقینی ہے کہ وہ نہ شیطان پرست ہیں اور نہ یزید بن معاویہ انکا مورث اعلیٰ تھا ۔

کاروان نمود

(جہیز دیکھ کر)

مضمحل ہو کر سمٹتا جا رہا ہے آفتاب — مئے سے بوجھل ہو جیسے فاختہ کی چشم خواب
سو چلی ہے رفتہ رفتہ شورش دنیائے دوں — جھٹ پٹا برسا رہا ہے اپنے جادو کا سکوں

اک مسہری پر سجا ہے کبر کا باطل وقار
ہنس رہی ہے زینت ہستی کی مصنوعی بہار

صف بصف رنگین حُلّے ریشمیں و زر نگار — جیسے رومانی فضاؤں میں ہو پریوں کی قطار
سرد سائے گرم شالیں، کہکشاں گوں ساریاں — جن میں ہیں سلمہ ستارے کی خنک چنگاریاں
قیمتی مقیش کی دامن میں زریں جھالریں — جیسے لٹکی ہوں شعاعیں حلقۂ قندیل میں
نرم گدّے گدگدے قالین خواب آور لحاف — میز، کرسی، کوچ، صوفے، آئینے، پردے، غلاف
جن میں تصویریں مناظر کی ہیں اور گلکاریاں، — بعض میں سرو و چنار اور بعض میں مرغابیاں
مخمل و کمخواب کے زربفت اور اطلس کے تھان — کر رہا ہے تبصرہ ان پر ہر اک بوڑھا جوان
کانچ اور چینی کے ساغر سونے چاندی کے گلاس — تشنگی بجھ جائے ایسا رنگ کا ہے انعکاس
فرش پر آراستہ ہیں شوخ و رخشندہ ظروف — چرخ کے صفحہ پہ جیسے چاند تاروں کے حروف

بزم میں ہوں غنا کے جگمگاتے شعبدات
خوشۂ پروین کی صورت اک لگن میں زیورات

خوبصورت جانماز اک رحل سے لپٹی ہوئی — ہے برائے بیت وہ بھی پائمتی رکھی ہوئی
اک طرف ہے خوشنما جزدان میں قرآن بھی، — تاکہ لوگوں کو یقیں ہو "ہیں = ہا ایمان بھی"

بہر آرایش حسیں گلدان اور فانوس بھی
رسم کے گندے صنمخانے میں ہیں ناقوس بھی

خواب کے دہمی مناظر کا طلسمی سلسلہ — یا مسلسل حسرتوں کا ایک جھوٹا قہقہہ
شوق کی گرمی سے بیہودہ رواجوں کا اُبال — یا کفِ افسوس پر آسودہ حالی کا اُگال،

ایک ناجائز نمائش شفقت و احساں کی ہے
برملا توہین گویا دُخترِ انساں کی ہے

دیکھ کر خوش ہو رہا ہے اک رنگیلا آدمی — جس کی آنکھوں میں ہے افسردہ شرار زندگی
اس کے چہرے سے عیاں ہے غیر آسودہ فراغ — بتکدے میں مشتعل ہو جیسے بے روغن چراغ
قلب تیرہ، ذہن ناقص، جہل پروردہ دماغ — سر میں شہرت کا جنوں ہے، قرض کا سینے میں داغ

وائے دولت کا جنازہ مفلسی کے دوش پر!
کیوں نہیں گرتی ہے بجلی ان کے عقل و ہوش پر

اللہ اللہ یہ سجاوٹ، یہ غرور رائگاں، — منزلِ فانی میں ان کا یہ مزین کارواں
خود فشاں، یہ سیمگوں سوغات کا انبار دیکھ! — عرصۂ ہستی میں آب و رنگ کا بازار دیکھ!
اس بہارستاں میں اب بوئے خزاں پاتا ہوں میں — بطنِ مستقبل میں آسیبِ گراں پاتا ہوں میں،
کس طرح دیتی ہے اُمت دعوتِ ادبار دیکھ — آنے والی پستیوں کے دور سے آثار دیکھ!

دوسروں کو جو دیا کرتے تھے درسِ زندگی
خود انھیں گھیرے ہوئے ہیں ظلمتیں اسراف کی

ابوالاسرار افریؔ اٹاوی

غزل

بے ہوش آشیاں سے، بے قید گلستاں سے — کھیلا کیا ہوں برسوں ہر برقِ بے اماں سے
ایسے بھی ہم نے منظر دیکھے ہیں آشیاں سے — سو بار آ کے بجلی پلٹی ہے گلستاں سے
کیا واسطہ جبیں کو اب تیرے آستاں سے — یوں بھی تجھی کو دیکھا، دیکھا جہاں جہاں سے
منزل پہ جا رہا ہوں یوں ہٹ کے کارواں سے — جیسے میں بے خبر ہوں منزل کے ہر نشاں سے
بھولے ہوئے فسانے دہرا رہا ہے کوئی — اے میری عمرِ رفتہ لاؤں تجھے کہاں سے
کیا پوچھتا ہے مطرب دل کی نزاکتوں کو — نغمہ بھی کم نہیں ہے اب تو خراشِ جاں سے
اے عشق کارفرما اب تو یہ کیفیت ہے — پڑتے ہیں پاؤں جس جا اُٹھتے نہیں وہاں سے

منزل کی جستجو میں کھو جائیں کھونے والے
بڑھتے ہیں شورؔ آگے اب ہم تو کارواں سے

(پروفیسر) شورؔ

وقت کی باتیں

کبوتر اور جنگ

موجودہ جنگ کا آغاز ہی ہوا تھا کہ برطانیہ کے محکمۂ جنگ نے حکم نافذ کیا کہ تمام پلے ہوئے کبوتر آزاد کر دئے جائیں۔ اس سے مدعا یہ تھا کہ غیر ملکوں کے جتنے کبوتر ہیں وہ اپنے اپنے ملکوں کو واپس چلے جائیں اور ان میں جرمنی کے کبوتر بھی شامل تھے۔

چونکہ پچھلی لڑائی میں یہ تلخ تجربہ ہو چکا تھا کہ غیر ملکی جاسوس یا ایجنٹ جرمنی کے کبوتروں کے ذریعہ سے یہاں کی خبریں وہاں پہونچایا کرتے تھے اور اس سے سخت نقصان پہونچا تھا، اس لئے اس مرتبہ یہ احتیاط کی گئی کہ پہلے ہی سے تمام غیر ملکی کبوتر ملک سے باہر کر دئے گئے۔ لیکن ناتسیوں نے اب ایک اور ترکیب اختیار کی ہے۔ رات کو ان کے ایجنٹ چھوٹے سے ہوائی جہاز میں بیٹھکر برٹش چینل کو عبور کرتے ہیں، ان کے ساتھ بید کی ٹوکری میں ایک یا دو جوڑے کبوتروں کے بھی ہوتے ہیں اُتر کر ان کبوتروں کو چھوڑ جاتے ہیں اور پھر یہاں سے انھیں کبوتروں کے ذریعہ سے خبریں پہونچائی جاتی ہیں۔

برطانیہ کے محکمۂ جنگ نے اس سے بہتر طریقہ اختیار کیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے گیس بھرے ہوئے غبارے جو وقت مقررہ پر کھلتے ہیں، کبوتروں کی ٹوکری میں لٹکائے جاتے ہیں۔ اور اس طرح دشمن کے مقبوضہ علاقہ میں یہ پیغامات پہونچاتے ہیں کہ فرانسیسی، ڈچ یا زیک جس علاقہ میں بھی یہ کبوتر پہونچیں، وہاں کے لوگ انھیں کبوتروں کے ذریعہ سے مفید اطلاعات فراہم کریں۔ اس طرح دشمن کے بہت سے کارخانوں، ہوائی اڈوں اور فوجی مرکزوں کا پتہ چلا یا جاتا ہے۔

محکمۂ بحریہ میں بھی کبوتروں سے بہت کام لیا جاتا ہے۔ چنانچہ سرنگیں ہٹانے والے جہاز جن میں وائرلس کے آلات نصب نہیں ہوتے، کبوتروں کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں اور جب کوئی خطرہ ہوتا ہے تو انھیں کبوتروں کے ذریعہ سے اطلاع دیجاتی ہے۔

پچھلی جنگ سے قبل، امریکہ کی افواج میں خبریں دینے والے دستے کبھی کبھی کبوتروں کے ذریعہ سے بھی اطلاعات دیا کرتے تھے۔ لیکن ۱۹۱۷ء میں اس چیز کو باقاعدہ بنا دیا گیا اور ہر فوج کے ساتھ ایک خاص دستہ کبوتروں کے ذریعہ سے پیام پہونچانے والا مقرر کر دیا گیا۔ کبوتروں کی یہ خصوصیت کہ ان سے ہر وقت ہر موسم میں یہ کام لیا جا سکتا ہے، بہت مفید ثابت ہوئی اور اشتہار دیدیا گیا کہ جو کوئی کبوتروں سے اس قسم کا کام لے سکتا ہے وہ اپنی خدمات پیش کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سولہ ہزار ماہرین جمع ہو گئے اور ایک باقاعدہ محکمہ اس کا قایم ہو گیا۔ چنانچہ پچھلی جنگ میں ہزاروں امریکن کبوتروں سے فرانس میں کام لیا گیا۔

ٹیلی فون کے ذریعہ سے خبر رسانی جبکہ تار کاٹ دئے جائیں ناممکن ہو جاتی ہے، اسی طرح جب موسم خراب ہوتا ہے یا زہریلی گیس فضا میں پھیلی ہوئی ہوتی ہے تو ہوائی جہازوں سے بھی کام نہیں لیا جا سکتا، لیکن کبوتروں کے لئے کوئی چیز حارج نہیں ہوتی اور وہ اپنی منزل تک کسی نہ کسی طرح پہونچ ہی جاتے ہیں، چنانچہ پچھلی جنگ میں ۹۰ فی صدی پیغامات کبوتروں ہی کے ذریعہ سے پہونچائے گئے۔

اب اس فن میں اور زیادہ ترقی ہو گئی ہے۔ پہلے ایک دن میں دو سو میل یا زیادہ سے زیادہ فی منٹ ایک میل کی پرواز بڑی کامیابی سمجھی جاتی تھی، لیکن آج کل جو کبوتر دن بھر میں ۵۰۰ میل پرواز کرتا ہے وہ کسی کام کا نہیں سمجھا جاتا۔ اب اوسطی پرواز ۶۰ میل فی گھنٹہ ہے اور اس رفتار سے وہ رات دن پرواز کر سکتے ہیں۔

پہلے کبوتر دن ہی دن میں اُڑتے تھے۔ جب شام ہو جاتی تھی تو وہ کسی درخت میں پناہ لیتے تھے اور صبح کو پھر واز شروع کرتے تھے۔ اس سے بعض اہم پیغامات بعد از وقت پہونچتے تھے، لیکن اب ان کو رات کے وقت بھی اُڑنا سکھایا گیا ہے اور اس طرح بغیر ایک لمحہ ضایع کئے ہوئے خبریں ٹھیک وقت پر پہونچائی جا سکتی ہیں۔

پہلے خبریں پہونچانے کا طریقہ یہ تھا کہ کسی کاغذ پر پیام لکھکر کبوتر کے دُم کے پروں سے باندھ دیا جاتا تھا، لیکن اب یہ پیام ایک چھوٹی سی سلولائڈ کی نلکی میں رکھدیا جاتا ہے اور نلکی کبوتر کے پاؤں میں باندھ دیجاتی ہے، اسی کے ساتھ بعض کاغذات اور تصویریں سینہ پر بھی باندھ دیتے ہیں جس سے اس کی پرواز میں کوئی اثر نہیں پڑتا۔ پہلے پیام کو موٹے حرفوں میں لکھتے ہیں اور پھر اس کا بہت ہی چھوٹا فوٹو لیکر نلکی میں رکھدیتے ہیں۔ بعد کو اس فوٹو کا عکس بڑا کرکے پیام پڑھ لیا جاتا ہے۔

کبوتروں کے ذریعہ سے تصویریں بھی حاصل کی جاتی ہیں۔ چنانچہ جاپان اور جرمن کی فوجی درسگاہوں میں اس قسم کی تصویریں لینے کا فن سکھایا جاتا ہے۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ ایک دو انچ کا ایلومینیم کا کیمرا کبوتر کے سینے پر باندھ دیا جاتا ہے۔ اس کیمرے میں ربڑ کا ایک چھوٹا سا گیند لگا ہوتا ہے جو ہوا کے دباؤ سے کبوتر

کے الفل کو کھڑا تا بند کرتا ہے اور اس طرح ایک وقت میں دو درجن تصویریں لیجا سکتی ہیں جب کبوتر واپس آتے ہیں تو ان کے سینے سے فوٹو کے کیمرے کھول کر تصویریں چھاپ لی جاتی ہیں اور دشمن کے بہت سے اہم مرکزی مقامات کا پتہ ان سے چل جاتا ہے۔

چونکہ جانوروں میں موسم کے پہچاننے کے طبعی حس موجود رہتی ہے، اس لئے کبوتر جانتے ہیں کہ انھیں بادلوں، ہواؤں، برفباریوں اور کوہر وغیرہ سے بچکر کس طرح اڑنا چاہیے، چنانچہ جب پہاڑوں کی بلندی پر ہوا بہت تیز ہوتی ہے تو وہ نیچے وادیوں میں سے گزرتے ہیں اور جب نیچے ہوا تیز ہوتی ہے تو وہ میلوں بلند ہو کر پرواز کرتے ہیں اگر اپنے مرکز پر پہونچتے وقت موسم طوفانی ہوتا ہے تو یہ گھنٹوں فضا میں اڑتے رہتے ہیں اور جب طوفان ختم ہو جاتا ہے تو ہزاروں فٹ کی بلندی سے ڈھیلے کی طرح گر کر اپنے اڈے تک پہونچ جاتے ہیں۔

ایک ہی محاذ پر پھیلی ہوئی فوج کے مختلف حصوں میں بھی کبوتروں کے ذریعہ سے اطلاعات پہونچائی جاتی ہیں، اور ایک خبر رساں دستہ دوسرے خبر رساں دستہ کو بھی ان کی وساطت سے اپنے پیام پہونچا سکتا ہے۔

عہدِ حاضر کا سپاہی

اس وقت سپاہی بننا بہت مشکل ہے۔ پہلے صرف یہ دیکھا جاتا تھا کہ جسمانی اعضاء مضبوط ہیں یا نہیں اور کوئی ایسی بیماری تو اسے لاحق نہیں ہے جو اسے جلد تھکا دے۔ لیکن اب علاوہ صحت جسمانی کے دماغی صحت کا بھی امتحان لیا جاتا ہے اور بہت کم ایسے ہیں جو اس "نفسیاتی امتحان" میں پورے اترتے ہوں۔

اس نفسیاتی امتحان کے ذریعہ سے یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ وہ کس کام کا زیادہ اہل ہے اور وہی کام اس کے سپرد کیا جاتا ہے۔ اس امتحان کے سلسلہ میں بعض بہت عجیب و غریب سوال کئے جاتے ہیں جن کا جواب اس کو فوراً دینا چاہیئے۔

مثلاً ایک رنگروٹ سے پوچھا گیا "اگر ایک برقی ٹرین شمالی مشرقی سمت ۶۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہی ہے تو اس کا دھواں کس رُخ کو جائے گا"

ظاہر ہے کہ برقی ٹرین میں دھواں کہاں، لیکن فوراً ذہن کا اس طرف منتقل ہونا مشکل تھا اس لئے اس نے کچھ جواب دیدیا کہ دھواں فلاں رُخ کی طرف جائے گا۔

ایک دوسرے رنگروٹ سے کہا گیا "ایک آدمی سڑک پر سے گزرتے ہوئے موٹر سے ٹکرا جاتا ہے اور اس کا سر پاش پاش ہو کر فوراً دم نکل جاتا ہے لوگ اسے اسپتال لیجاتے ہیں لیکن وہاں معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں"

اس کا جواب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ جب وہ مر گیا تھا تو پھر بچنے کی امید کا کیا سوال۔ لیکن ہر شخص کا ذہن اس طرف منتقل نہیں ہو سکتا۔

ایک تیسرے شخص سے کہا گیا "ایک آدمی نے خواب دیکھا کہ اسے پھانسی دیجانے والی ہے، اسی خواب کی حالت میں اس کی گردن پر کوئی بھاری چیز گری اور وہ اس صدمہ سے مر گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب وہ مر گیا تھا تو یہ کیونکر معلوم ہوا کہ اس نے یہ خواب دیکھا تھا۔ مگر فوراً یہ بات سمجھ میں آنا آسان نہیں۔

الغرض اسی طرح کے بہت سے امتحانات کئے جاتے ہیں اور ان کے بعد فیصلہ کیا جاتا ہے کہ فلاں شخص کس خدمت کے قابل ہے۔ چنانچہ ایسا شخص جو افسر بننے کا اہل ثابت ہو بہت کم نکلتا ہے۔

اس قسم کے امتحانات کا رواج جرمنی میں بہت ہے اور وہاں نہایت سختی سے ان پر عمل کیا جاتا ہے۔ ہوابازوں کے لئے جو امتحانات مقرر ہیں وہ اور زیادہ سخت ہیں۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ یورپ کی فوج اس وقت بہترین انسانوں کا مجموعہ ہے اور دنیا انھیں بہترین انسان سے خالی کی جا رہی ہے۔

چاء کی پیالی میں طوفان

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات بہت معمولی معمولی باتیں بڑی بڑی لڑائیوں کا باعث ہوئی ہیں اور خونریز جنگ ہی نے برسوں تک قایم رہنے والی آگ دنیا میں مشتعل کر دی۔

ایکبار ترکی اور وینس میں صرف اس لئے لڑائی لڑی گئی کہ ترکی کے ایک سفیر کی داڑھی کا تمسخر کیا گیا تھا اور اب سے ۶۰۰ سال پہلے نصف یورپ میں لڑائی کی آگ صرف اس لئے مشتعل ہو گئی کہ بولوشن کے کسی کنویں سے ایک ڈول پانی چرا لیا گیا تھا

چین میں ایک بار نہایت خونریز جنگ صرف ایک چاء دان کی بدولت چھڑ گئی۔ اس کا واقعہ یہ ہے کہ کوئی چینی سردار اپنی چاء دان کو بہت پسند کرتا تھا بدقسمتی سے اسکا ملازم جسکے پاس چاء دان رہتا تھا فراموش کے نشہ پڑ گیا اور چاء دان ٹوٹ گیا۔ چینی سردار نے اس کا بدلہ لینے کی قسم کھائی اور بادشاہ

کو آمادہ کیا کہ ان قزاقوں کا قلع قمع کردے۔ چنانچہ قزاقوں کے خلاف یہ لڑائی تقریباً سو سال تک جاری رہی اور دس لاکھ جانیں اس میں ضایع ہوئیں چینی کی تاریخ میں اس لڑائی کو "چاہ دان کی لڑائی" کہتے ہیں۔

کوئی شخص مشکل سے یقین کرسکتا ہے کہ صرف بچہ کا نام رکھنے پر لڑائی چھڑ سکتی ہے، لیکن ایک بار ایسا بھی ہوا۔ فرانس میں فرانسیس اول کی حکومت کے زمانہ میں یہ دستور تھا کہ جب کوئی بچہ بادشاہ کے پیدا ہوتا تھا تو پڑوس کے کسی فرمانروا کو دعوت دیجاتی تھی تاکہ وہ آکر بچہ کا نام تجویز کرے۔ چنانچہ اس موقعہ پر سوئٹزرلینڈ کے بادشاہ کو دعوت دی گئی، وہ آیا اور اس نے بچہ کا نام (Shadrach) رکھا لیکن فرانسیس نے اسے منظور نہ کیا۔ شاہ سوئٹزرلینڈ کو یہ بات سخت ناگوار ہوئی اور آخر کار دونوں ملکوں میں لڑائی چھڑ گئی جو ایک سال تک جاری رہی اور جس میں سوئٹزرلینڈ کو سخت شکست اٹھانا پڑی۔

زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ یورپ میں ایک کھڑکی کی وجہ سے ۹ سال تک لڑائی جاری رہی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ فرانس کے بادشاہ لوئی چہاردہم کا ایک وزیر تھا جس کا نام Lonnoi تھا۔ اس نے اپنے رہنے کے لئے ایک نیا مکان تعمیر کرایا اور بادشاہ کو وہاں دعوت دی۔

لوئی نے مکان کا معاینہ کرتے وقت ایک کھڑکی کو دیکھ کر کہا کہ یہ ٹھیک نہیں بنی، اوپر کی طرف زیادہ چوڑی ہے۔ وزیر نے کہا ایسا نہیں ہوسکتا اور اس پر اصرار کیا۔ آخر کار پیمایش ہوئی اور کھڑکی واقعی اوپر کی طرف آدھ انچ زیادہ چوڑی نکلی۔ گستاخی کی سزا میں وزیر کو علٰحدہ کردیا گیا، لیکن چونکہ یہ بڑا ذی اثر شخص تھا اس لئے اس نے قرب وجوار کی حکومتوں سے ملکر فرانس کے خلاف محاذ جنگ قایم کرادیا، یہ جنگ جو نو سال تک قایم رہی۔ اور ۱۶۹۶ء میں ختم ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوئی کو پھر اپنے وزیر کو بلانا پڑا اور فرانس کو انگلستان کے مقابلہ میں کافی نقصان اٹھانا پڑا۔

ایکبار تمباکو کے صرف ایک ڈبہ کی وجہ سے دو قوموں میں لڑائی چھڑ گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نپولین سے لڑائیاں ہورہی تھیں۔ اور برطانیہ کی طرف سے جہازوں کی دیکھ بھال ہوتی تھی کہ کوئی ممنوعہ شے تو ان میں نہیں ہے، اس سلسلہ میں ایک بار برطانوی جہاز Leopard نے امریکہ کے ایک تجارتی جہاز کو گولوں سے کچھ نقصان پہونچایا۔ Calhoun نے جو امریکن کانگرس کا ممبر تھا، معاوضہ طلب کیا۔ اتفاق سے اسکے چند دن بعد ہی برطانوی جہاز نے امریکہ کے ایک اور تجارتی جہاز کو روکا جس کا کپتان Calhoun کا عزیز تھا۔ یہ جہاز بھی دیکھ بھال کے لئے روکا گیا تھا۔ اول اول تو کوئی ممنوعہ شے برآمد نہیں ہوئی، لیکن بعد کو خود کپتان کی جیب سے تمباکو کا ایک ڈبہ نکلا اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ Calhoun نے کانگرس کو جنگ پر آمادہ کردیا اور امریکہ نے کناڈا پر حملہ کردیا۔

کبھی کبھی ڈاک کا ٹکٹ بھی لڑائی کا سبب بن سکتا ہے۔ ۱۹۰۰ء میں Dominicia نے ایک ٹکٹ جاری کیا جس میں ریاست کا نقشہ چھپا ہوا تھا، لیکن اس نقشہ میں ریاست کے جو حدود دکھائے گئے تھے وہ درست نہ تھے اور دوسری ملحقہ ریاست Haiti کی زمین کو بھی اپنے اندر لئے ہوئے تھے۔ اس پر دونوں طرف سے تلواریں کھنچ گئیں اور اگر یہ ٹکٹ منسوخ نہ کیا جاتا تو جنگ یقینی تھی۔

ایک تازہ ترین واقعہ ۱۹۲۷ء کا سنئے۔ حکومت Paraguay نے ایک ٹکٹ چھاپا جس کے نقشہ میں ایک ایسے حصۂ زمین کو بھی شامل کرلیا جو کسی کا نہ تھا۔ تین سال بعد Bolivia نے اپنا ٹکٹ شایع کیا اور اس میں اس حصۂ زمین کو اپنی ملکیت ظاہر کیا۔

دونوں حکومتوں میں اس پر بحث ہوئی لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا اور آخر کار کامل دو سال تک آپس میں لڑتی رہیں اور ہزاروں آدمی دونوں طرف کے جان سے مارے گئے!

"نگار"

جنوری فروری ۱۹۴۱ء اور جنوری فروری ۱۹۴۲ء

یہ دونوں پرچے آپ کے پاس ہیں یا نہیں۔ اگر نہیں ہیں تو اب طلب فرمالیجئے! ان میں سے کوئی ایک ہے اور دوسرا نہیں، تو دوسرا بھی منگالیجئے۔ ورنہ ایک وقت آئے گا کہ مومن نمبر، ظفر نمبر، اردو شاعری نمبر، ہندی شاعری نمبر کی طرح یہ دونوں نمبر بھی کسی قیمت پر نہ مل سکیں گے۔ ان دونوں نمبروں کی اہمیت کا اندازہ اگر آپ اس وقت نہ کریں گے تو بعد میں کریں گے، لیکن یہ وقت وہ ہوگا جب آپ انھیں حاصل نہ کرسکیں گے۔

مینیجر نگار۔ لکھنؤ

مطبوعات موصولہ

نئے ادبی رجحانات

اُردو ہندی کی نزاع، سیاسی نقطۂ نظر سے بیشک نقصان رساں ثابت ہوئی لیکن علمی حیثیت سے اس نے فایدہ بھی پہونچایا یعنی اگر ایک طرف ہندی میں تصانیف و تالیفات کی گرم بازاری شروع ہوئی تو دوسری طرف اُردو میں بھی اچھی اچھی کتابیں شایع ہونے لگیں - گو تعداد کے لحاظ سے مقابلتاً اُردو پیچھے ہے -

اس میں شک نہیں کہ تالیفات کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے بہ حیثیت مجموعی، اُردو کا پلّہ اب بھی بھاری ہے، لیکن یہ بھی چند دن کی بات ہے، کیونکہ ہندی والے جس جوش و خروش سے ہندی زبان کے احیار میں مصروف ہیں اور ہندو پبلک جس فراخ دلی سے ہندی کتابوں کی اشاعت میں مدد دے رہی ہے، ہندی لٹریچر کی "کمیت" کے ساتھ اس کے معیار کو بھی بلند کردے گا اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس سے اُردو داں پبلک مفید سبق لے سکے گی یا نہیں - بہرحال اس نزاع کی بدولت اس وقت اُردو میں بھی اچھی کتابیں شایع ہو رہی ہیں اور انھیں میں سے ایک "زیر تبصرہ" کتاب بھی ہے -

ادب اُردو کی تاریخ پر اس دوران میں متعدد کتابیں، اچھی بری، چھوٹی بڑی شایع ہو چکی ہیں، لیکن "رجحانات جدیدہ" پر کوئی کتاب نہ لکھی گئی تھی - اس لئے یہ امر باعث مسرت ہے کہ سید اعجاز حسین صاحب لکچرر الہ آباد یونیورسٹی نے اس کمی کو بھی پورا کر دیا -

یہ کتاب چھوٹے سائز کے ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں نظم و نثر دونوں کے نئے رجحانات پر گفتگو کی گئی ہے - شروع میں پہلے انھوں نے دور متقدمین پر ایک مختصر لیکن جامع تبصرہ کرکے بتایا ہے کہ اُس وقت ادبی رجحانات کیا تھے اور پھر ۱۸۵۷ء کے بعد جو مختلف تحریکیں ہندوستان میں شروع ہوئیں ان کو سامنے رکھ کر نظم و نثر کے تاثرات سے بحث کی ہے - اس کے بعد تیسرا لیکن اہم دور جنگ عظیم کے بعد کا تھا اور اسی دور پر خصوصیت کے ساتھ انھوں نے بہت کچھ لکھا ہے - چونکہ یہ زمانہ قدامت پسندی کے خلاف جہاد کا زمانہ ہے اور ایک نوع کی بحرانی کیفیت اہل قلم کے نوجوان طبقہ میں ہر جگہ پائی جاتی ہے، اس لئے جذبات کے ساتھ ساتھ اسلوب بیان میں بھی اک قسم کا ہیجان رونما ہوا ہے جس میں سلامت روی، بیراہ روی، تناسب و عدم تناسب سبھی کچھ پایا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے جوش اور اُبال کے زمانہ کے لٹریچر کو سامنے رکھ کر کوئی معقول گفتگو کرنا آسان نہ تھا، لیکن سید اعجاز حسین صاحب نے جس خوبصورت اختصار کے ساتھ اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے وہ کامیاب ایجاز کی بہت اچھی مثال ہے - وہ حضرات جو تاریخ ادب کے مطالعہ کے لئے زیادہ وقت نہیں دے سکتے، یا مقابلہ کے امتحانوں میں شرکت کا ارادہ رکھتے ہیں ان کے لئے یہ کتاب بہت مفید ہے - کتاب طباعت و کتابت کے لحاظ سے بھی کافی دلکش ہے -

قیمت تین روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ سید انصار حسین - نشیمن - ۷ - منٹو روڈ مراد آباد -

متین کے سو شعر

سو سو اشعار کے انتخاب کی بدعت یا سنت جامعۂ ملیہ نے ایسی قایم کردی ہے کہ جس شاعر کو دیکھئے وہ اسی خبط میں مبتلا نظر آتا ہے ہر چند اس وقت جبکہ کاغذ گراں ہے، یہ خیال بُرا نہیں، لیکن اس کا ایک نقصان ضرور ہے اور وہ یہ کہ اس طرح پبلک کو رائے قایم کرنے کا صحیح موقعہ نہیں ملتا - جناب متین مچھلی شہری، جن کے سو اشعار کا انتخاب "سبحۂ صد دانہ" کے نام سے جناب سید سعدی جعفری نے شایع کیا ہے، پرانے شاعر ہیں اور تلامذۂ داغ کی اولین صف میں شمار کئے جاتے ہیں، جیسا کہ حضرت سایل دہلوی نے کتاب کی تمہید میں اس کا اظہار کیا ہے -

ان کے کلام میں تمام وہ خصوصیات پائی جاتی ہیں جو داغ کی شہرت عام کا باعث ہوئیں، مثالاً چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

ایمان کی تو یہ ہے پرستش کی چیز ہے — ہر ایک سنگ اس بُتِ کافر کی راہ کا ،
وہ اپنا شوق پنہاں اور انداز حیا ان کا — مگر پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اقرار ہو جانا
ممکن نہیں عیاں نہ ہو کچھ فتنۂ خرام — تلوار چل گئی ہے، گئے ہیں جدھر سے آپ

چونکہ اس قسم کی شاعری کا دور اب ختم ہو رہا ہے، اس لئے جناب سعدی جعفری نے اچھا کیا کہ یہ انتخاب شایع کر دیا -

یہ انتخاب مکتبۂ ادب - فاطمہ اسٹیٹ - پریاگ الہ آباد سے دو آنے میں ملسکتا ہے -